www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

April 2009 • No. 389

وقت کے استعمال کا بجٹ بنایئے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 250
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

الرسالہ
اپریل 2009

اصلاحِ قلب یا اصلاحِ شعور 2
سجدۂ قربت 3
عجلت پسندی 4
انسان ایک استثنائی مخلوق 5
رعایت ایک
سنتِ رسول 6
سب سے بڑا فتنہ 7
اسبابِ شکر کو دریافت کیجیے 8
قادرِ مطلق، عاجزِ مطلق 9
قرآن:
تلاشِ فطرت کا جواب 10
تحفہ کلیجر 11
دعوت اور اقدام کا فرق 12
خدا کا وجود 13
تعمیرِ دنیا، تعمیرِ شخصیت 14
یہ بھی جھوٹ ہے 15
موت کے بعد 16
امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر 18
مسلمان کی اصل حیثیت 20
بااصول زندگی 22
جنت کا مستحق کون 24
پہلی واپسی، دوسری واپسی 26
بلند فکری 29
سب سے بڑا مسئلہ 30
منطقی طرزِ استدلال 31
خدا اور انسان 32
اہتزاز یا مشقت 33
قسمتِ انسانی 34
معذوری کے باوجود 35
خوشی صرف آخرت میں 36
ذہین آدمی کا فتنہ 37
شادی شدہ زندگی
کے مسائل 38
رکاوٹ کے بغیر 38
عادت اور ضرورت 40
بل تو اپنا بل 41
سوال و جواب 42
خبر نامہ اسلامی مرکز 45

اصلاحِ قلب یا اصلاحِ شعور

قرآن کی سورہ نمبر 26 میں ارشاد ہوا ہے کہ آخرت میں جنت میں داخلے کا مستحق وہ قرار پائے گا جو قلبِ سلیم کے ساتھ وہاں پہنچے: إلاّ مَن أتی اللہ بقلبٍ سلیم (الشعراء: 89)۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ: إلاّ مَن أتی اللہ بأعمالٍ کثیرۃ (مگر وہ شخص جو بہت زیادہ اعمال لے کر آئے)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جنت کی قیمت حقیقتاً کمیاتی عمل نہیں ہے، بلکہ کیفیاتی عمل ہے، یعنی وہ عمل جس کا تعلق قلبِ سلیم سے ہو۔

اِس آیت میں قلب سے مراد معروف معنوں میں دل نہیں ہے، بلکہ شعور ہے۔ سلیم یا سلامت کا مطلب ہوتا ہے — بَری ہونا۔ ضحّاک بن مُزاحم تابعی (وفات: 723ء) نے قلبِ سلیم کی تفسیر قلبِ خالص سے کی ہے (تفسیر القرطبی)۔ قلبِ سلیم سے مراد ہے — آلائش سے پاک قلب (pure heart)، یعنی جو شخص دنیا میں اپنی فطرت کو آلائش سے بچائے اور صحیح فطرت کے ساتھ آخرت میں پہنچے۔ اِس کو دوسرے لفظوں میں ڈی کنڈیشنڈ روح (de-conditioned soul) بھی کہہ سکتے ہیں۔ قلب کا لفظ یہاں اپنے لٹرری معنیٰ میں ہے۔ ادبی استعمالات میں قلب کا لفظ مرکزِ شعور کے معنیٰ میں رائج ہوگیا ہے۔ اور قرآن انسانی زبان میں نازل ہوا ہے، اِسی مفہوم کے اعتبار سے قرآن میں بھی اِس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حقیقی معنویت کے اعتبار سے، اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو انسان اپنے شعور کی اصلاح کرے، جو اپنی فطرت کو بعد کی آلائشوں سے پاک کرے، جو ماحول کی کنڈیشننگ کو توڑ کر اپنے آپ کو ایک ڈی کنڈیشنڈ مائنڈ (de-conditioned mind) بنائے۔ ایسے ہی انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہوگی، ایسا ہی انسان صراطِ مستقیم پر چل سکے گا۔

اصل یہ ہے کہ ہر انسان صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر ماحول کے اثر سے اُس کی فطرت گرد آلود ہوتی رہتی ہے۔ اِن خارجی اثرات سے پاک کرکے فطرت کو اس کی اصل حالت پر قائم کرنے کا نام محاسبہ یا ڈی کنڈیشننگ ہے۔ یہی بے لاگ محاسبہ اِس بات کا ضامن ہے کہ آدمی صحیح فطرت یا قلبِ سلیم کا حامل ہو۔ اور جو لوگ ایسا کرسکیں، وہی وہ لوگ ہیں جو قلبِ سلیم کے ساتھ خدا کے یہاں پہنچیں گے اور آخرت میں جنت کی ابدی دنیا میں داخلے کے مستحق قرار پائیں گے۔

سجدۂ قربت

قرآن کی سورہ نمبر 96 میں ارشاد ہوا ہے: **واسجد واقترب** (العلق: 19) یعنی سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أقرب ما يكون العبد من ربّه وهو ساجد، فأكثروا الدعاء** (صحيح مسلم، كتاب الصلاة) یعنی بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اُس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ سجدے میں ہوتا ہے، اِس لیے تم سجدے کی حالت میں زیادہ سے زیادہ دعا کرو۔ قربتِ خداوندی کا یہ معاملہ صرف شکلِ سجدہ پر نہیں ہے، بلکہ روحِ سجدہ پر ہے۔ ایک واقعہ اِس معاملے کی وضاحت کرتا ہے۔

بنگلور کا واقعہ ہے۔ ایک ہندو نوجوان کی بعض عادتوں سے اُس کا باپ سخت ناراض ہو گیا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ ایک عرصے تک وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ آخر کار، اس کی ملاقات ڈاکٹر احمد سلطان (وفات: 1999) سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارا باپ تم کو دوبارہ قبول کر لے تو اس کی صرف ایک صورت ہے۔ تم خاموشی سے اپنے گھر جاؤ، اور وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ جب دروازہ کھلے اور تمھارا باپ تمھارے سامنے آئے تو تم فوراً ہی باپ کے پیروں پر گر پڑو، اور کہو کہ باپ، مجھ سے غلطی ہوئی، مجھ کو معاف کر دے۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ جب لڑکا روتے ہوئے اپنے باپ کہ پیروں پر گر پڑا تو باپ بھی رونے لگا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور اس کو معاف کر کے دوبارہ اپنے گھر میں داخل کر لیا۔

سجدہ بلاتشبیہ اِسی قسم کی ایک حالت ہے۔ سجدہ کوئی رسمی فعل نہیں۔ حقیقی سجدہ یہ ہے کہ ایک بندہ شدتِ احساس سے بے چین ہو جائے اور بے تابانہ طور پر وہ اپنا سر زمین پر رکھ دے۔ ایسا سجدہ گویا کہ اپنے رب کے قدموں میں سر رکھنے کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔ ایسا سجدہ تسلیم ورضا کی آخری صورت ہے۔ جب کوئی بندہ اِس طرح اپنے آپ کو آخری حد تک خدا کے آگے سرینڈر (surrender) کر دے تو خدا کی رحمت کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اس کو معاف فرما کر اُسے اپنی رحمتوں کے سایے میں لے لے۔

عجلت پسندی

قرآن کی سورہ نمبر 21 میں ارشاد ہوا ہے: **خُلق الإنسان من عجل** (الأنبیاء: 37) یعنی انسان پیدائشی طور پر عجلت پسند ہے۔ ایک حدیثِ رسول میں بتایا گیا ہے کہ: **التأنّي من الله، والعجلة من الشیطان** (التّرمذی، کتاب البرّ والصلة) یعنی بُردباری اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت شیطان کی طرف سے۔

انسانی فکر اور انسانی عمل دونوں کے لیے دو طریقے ہوتے ہیں — ایک ہے عجلت کا انداز، اور دوسرا ہے بردباری کا انداز:

To proceed hurriedly, To proceed unhurriedly

اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک صفت وہ رکھی گئی ہے جس کو حساسیت (sensitivity) کہا جاتا ہے۔ یہ حساسیت ایک استثنائی نوعیت کی قیمتی صفت ہے۔ لیکن ہر دوسری صفت کی طرح، اِس صفت کا بھی پلس پوائنٹ (plus point) اور مائنس پوائنٹ (minus point) ہے۔ اِس صفت کا پلس پوائنٹ مثال کے طور پر حیا ہے۔ اِسی طرح، عجلت اِس صفت کا ایک مائنس پوائنٹ ہے۔ یہ دراصل حساسیت ہے جس کی وجہ سے آدمی عجلت پسند بن جاتا ہے۔

حساسیت، خدا کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اگر حساسیت نہ ہو تو آدمی حیوان کے مانند ہو جائے گا۔ بُرائی کو برائی سمجھنے کا مزاج اس کے اندر سے ختم ہو جائے گا۔ عجلت کا مزاج اِسی حساسیت کا ایک منفی نتیجہ ہے۔ آدمی کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور فوری طور پر ایک رائے بنالیتا ہے، یا فوری طور پر وہ کوئی اقدام کر دیتا ہے۔ فکر یا عمل میں اِس قسم کا عاجلانہ انداز اِسی حساسیت کا ایک غیر مطلوب اظہار ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے عجلت پسندی کے مزاج کو عقل کے تابع بنائے۔ وہ ایسا کرے کہ بولنے اور کرنے سے پہلے سوچے۔ وہ سوچنے کے بعد کوئی بات کہے اور سوچنے کے بعد کوئی عمل کرے۔ عجلت پسندی کو قابو میں رکھنے کا یہی واحد طریقہ ہے — عجلت پسندی کا مزاج تو ختم نہیں ہوسکتا، البتہ عقل کے تابع رکھ کر اس کو مفید بنایا جاسکتا ہے۔

انسان ایک استثنائی مخلوق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ اِس کے مطابق، آپ نے فرمایا: **خلق الله آدم علىٰ صورته (صحيح البخاري، كتاب الإستئذان؛ صحيح مسلم، كتاب البر، كتاب الجنة؛ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 244)** یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جسمانی شکل وصورت کے اعتبار سے، انسان خدا کے مانند ہے۔ یہاں ''صورت'' سے مراد صفات (attributes) ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو محدود طور پر وہ صفات عطا فرمائی ہیں جو اللہ کی ذات میں اپنے کمال درجے میں موجود ہیں۔

انسان پوری کائنات میں ایک استثنائی مخلوق ہے۔ انسان ایک زندہ وجود ہے۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کو ایک جامع شخصیت (personality) عطا ہوئی ہے۔ انسان سوچتا ہے، انسان دیکھتا ہے، انسان سنتا ہے، انسان منصوبہ بند عمل کرتا ہے، انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ چیزوں سے انجوائے کرسکتا ہے۔ اِس قسم کی استثنائی خصوصیات ہیں جو پوری کائنات میں صرف انسان کا حصہ ہیں۔

انسان کو یہ استثنائی عطیات اِس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ استثنائی عمل کا ثبوت دے۔ یہ استثنائی عمل خالق کی شعوری معرفت ہے۔ اِس طرح خداوندِ ذوالجلال نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ معرفت کے درجے میں خدا کو دریافت کرے۔ وہ غیب کی حالت میں خدا کو دیکھے۔ وہ اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے بے اختیار کرلے۔ مجبوری کے بغیر وہ اپنے آپ کو خدا کے آگے سرینڈر کردے۔ وہ اپنے شعور کو بیدار کرکے اپنا ذہنی ارتقا کرے، وہ ذاتی دریافت کے درجے میں سچائی کو پائے۔ وہ سجدۂ معرفت کی سطح پر خدا کے آگے جھک جائے۔ وہ پورے عالمِ فطرت کو اپنی روحانی غذا بنالے۔ وہ اپنی شخصیت کا ارتقا اِس طرح کرے کہ وہ خداوندِ ذوالجلال کے پڑوس میں جگہ پانے کا مستحق بن جائے— جو آدمی اپنے اندر اِس قسم کی شخصیت (personality) نہ بنا سکے، وہ صرف انسان نما حیوان ہے، اس کی کوئی قیمت خدا کے یہاں نہیں۔

رعایت ایک سنتِ رسول

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **یَسِّروا ولا تعسِّرُوا، وبشِّروا ولاتُنَفِّرُوا (صحیح البخاری، کتاب العلم)** یعنی تم لوگوں کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرو، تم لوگوں کے ساتھ سختی کا معاملہ نہ کرو۔ تم لوگوں کو خوش خبری دو، تم لوگوں کو متنفر نہ کرو۔

اِس حدیثِ رسول میں دراصل انسانی رعایت کی تعلیم دی گئی ہے۔ حدیثوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ ہے کہ انسان کے ساتھ آخری حد تک رعایت کا معاملہ کیا جائے۔ قول یا عمل، کسی میں بھی شدت کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔

اِس رعایت کا مطلب لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ نا نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اصلاح کے عمل کے لیے صحیح نقطۂ آغاز (starting point) اختیار کیا جائے۔ اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اعمال کے ظاہری پہلوؤں کے بارے میں رعایت کا معاملہ کیا جائے اور زیادہ زور اور تاکید اعمال کے ظاہری پہلوؤں پر دیا جائے۔ کیوں کہ ظواہر کی اصلاح سے داخلی اصلاح نہیں ہوتی، بلکہ اِس کے برعکس، داخلی اصلاح سے ظواہر کی اصلاح ہوتی ہے۔

رعایت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو دین پر عمل کرنا، زیادہ مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ وہ متوحش ہوئے بغیر دینی اعمال کو اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے آدمی کے داخل کی اصلاح ہوتی ہے، پھر دھیرے دھیرے اس کے ظواہر بھی دین کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ رعایت دراصل حکیمانہ طریقِ کار کا دوسرا نام ہے، اور یہ ایک واقعہ ہے کہ حقیقی اصلاح ہمیشہ حکیمانہ طریقِ کار کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ غیر حکیمانہ طریقِ کار کے ذریعے۔ مُصلح کا طریقہ ہمیشہ رعایت کا ہونا چاہیے۔ مصلح کا سارا زور اِس پر ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے اندر جذبۂ عمل پیدا کرے۔ عمل کا جذبہ پیدا ہوتے ہی آدمی وہ کام خود کرنے لگتا ہے جس کو شدت پسند مصلح ناکام طور پر انجام دینا چاہتا ہے۔

سب سے بڑا فتنہ

صحیح مسلم اور مسند احمد میں ایک حدیث آئی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''عن جابر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنّ إبليس يضع عرشه على الماء، ثم يبعث سَرايا ه يفتنون الناس، فأدناهم منه منزلة أعظمهم فتنة۔ يجيء أحدهم فيقول: فعلت كذا وكذا۔ فيقول: ماصنعتَ شيئا۔ قال: ثم يجيئ أحدهم فيقول: ما تركته حتى فرّقت بينه وبين امرأته۔ قال فيدنيه منه، ويقول: نعم، أنتَ۔ قال الأعمش: أُراه قال ''فيلتزمه''، (رواه مسلم بحوالہ مشكاة المصابيح، رقم الحديث: 71)۔

حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابلیس اپنا تخت پانی (سمندر) کے اوپر بچھاتا ہے، پھر وہ دستوں کی شکل میں اپنے ساتھیوں کو بھیجتا ہے، تاکہ وہ لوگوں کو فتنے میں ڈالیں۔ ابلیس کے نزدیک درجے کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جس نے لوگوں کو زیادہ بڑے فتنے میں ڈالا ہو۔ ہر ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا اور میں نے وہ کیا۔ ابلیس کہتا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ پھر اُن میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایک شخص کے پاس پہنچا اور میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق ڈال دی۔ بس ابلیس اس کو اپنے قریب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہاں تم نے کام کیا۔ اعمش نے کہا کہ ابلیس اس کو اپنے سینے سے چمٹا لیتا ہے۔

اِس حدیث میں ایک اہم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ سماجی زندگی کا یونٹ گھر ہوتا ہے۔ اور گھر اِس طرح بنتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت شوہر اور بیوی کی حیثیت سے ایک گھر میں رہنا شروع کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق پڑ جائے تو گویا کہ سماجی عمارت کی ایک اینٹ کمزور پڑ گئی۔ قدیم زمانے میں یہ بُرائی صرف ایک محدود برائی تھی، مگر جدید تہذیب نے اُس کو ایک عالمی برائی کی حیثیت دے دی ہے۔ آج اجڑے ہوئے گھر (broken homes) کا ظاہرہ ایک عالمی ظاہرہ بن چکا ہے جس نے سماجی زندگی کو جنگل کی زندگی بنا دیا ہے۔

اسبابِ شکر کو دریافت کیجیے

اگر آپ لذیذ کھانا کھائیں اور اس کو کھا کر الحمدللہ کہیں تو یہ حیوانی درجے کا شکر ہے۔ کیوں کہ یہ مشاہدہ اور ذائقہ پر مبنی ہے، اور مشاہدہ اور ذائقہ کے درجے کا شکر صرف حیوانی درجے کا شکر ہے، وہ اعلیٰ انسانی درجے کا شکر نہیں۔

انسان کے درجے کا شکر یہ ہے کہ جب کھانا آپ کے سامنے آئے تو اس کو دیکھ کر خدا کا پورا تخلیقی نظام آپ کو یاد آجائے۔ آپ سوچیں کہ یہ تمام غذائی چیزیں پہلے غیر غذائی چیزیں تھیں۔ خدا نے ایک برتر عمل (process) کے ذریعے ایک عظیم واقعہ برپا کیا، وہ تھا غیر غذا (non-food) کو غذا (food) میں تبدیل کرنا۔ اِس طرح ایک کائناتی عمل کے ذریعے یہ تمام غذائی چیزیں وجود میں آئیں۔

پھر آپ یہ سوچیں کہ یہ غذائی چیزیں اپنی ابتدائی صورت میں میرے لیے توانائی (energy) کا ذریعہ نہیں ہوسکتی تھیں۔ چناں چہ خدا نے مزید یہ کیا کہ اُس نے میرے جسم کے اندر ایک پیچیدہ قسم کا نظامِ ہضم (digestive system) رکھ دیا۔ یہ نظامِ ہضم ایک خود کار نظام ہے۔ جب میں کوئی چیز کھاتا ہوں تو یہ نظامِ ہضم اِن غذائی چیزوں کو حیرت انگیز طور پر زندہ خلیات (living cells) میں تبدیل کر دیتا ہے، پھر یہ زندہ خلیات میرے جسم میں گوشت اور خون جیسی چیزوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر آپ کے اندر شکر کا ایسا احساس امنڈے، جس کو الفاظ میں ظاہر کرنے کے لیے آپ اپنے آپ کو عاجز پاتے ہوں۔

اِس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی شکر کیا ہے اور حیوانی شکر کیا۔ اگر آپ کے اندر صرف حیوانی درجے کا شکر ہے تو آپ ہمیشہ ناشکری کے احساس میں جئیں گے۔ شکر کے اعلیٰ احساس میں جینے کے لیے انسانی درجے کا جذبۂ شکر درکار ہے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ کم پائی جاتی ہے (وقليل من عبادي الشكور)۔ انسان سے اللہ تعالیٰ کو جو شکر مطلوب ہے، وہ انسانی درجے کا شکر ہے۔ صرف حیوانی درجے کا شکر انسان جیسی مخلوق سے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

قادرِ مطلق، عاجزِ مطلق

خدا اور انسان کے درمیان جو نسبت ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ خدا کُل ہے اور انسان اس کا جُز ہے۔ خدا سمندر ہے اور انسان اس کا ایک قطرہ ہے۔ اِس قسم کی تمام نسبتیں سرتاسر بے بنیاد ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان ''ہے'' اور ''نہیں'' کی نسبت ہے۔ خدا سب کچھ ہے اور انسان اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ خدا، واجب الوجود (self-existing) ہے، اور انسان مکمل طور پر اور ہر اعتبار سے خدا کے حکم سے وجود میں آنے والی صرف ایک مخلوق۔

انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ ایک صاحبِ شعور مخلوق ہے۔ انسان کے ذریعے اس کائنات میں شعوری عجز کا واقعہ وجود میں آتا ہے، اور بلاشبہہ اِس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے، جو اِس کائنات میں شعورِ قدرت کے مقابلے میں شعورِ عجز کی دوسری انتہا (extent) بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحے پر ''عدد'' کے مقابلے میں ''صفر'' کا ہندسہ تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلے میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

یہی شعورِ عجز انسان کا سب سے بڑا سرمایہ (asset) ہے۔ یہی کسی انسان کے لیے اس کی سب سے بڑی دریافت (discovery) ہے۔ جب کوئی عورت یا مرد عجز کی زبان بولیں، تو انھوں نے اپنی زبان کا صحیح استعمال کیا۔ اِس کے مقابلے میں جو عورت یا مرد فخر اور سرکشی اور خونمائی اور گھمنڈ اور اظہار برتری کی زبان بولیں، تو انھوں نے اپنی زبان کا غلط استعمال کیا۔ اِس دنیا میں صرف اُس انسان کو جینے کا حق ہے جو اِس کی قیمت ادا کرے، اور یہ قیمت عجز ہے۔ عجز کی قیمت ادا کیے بغیر اِس دنیا میں رہنا بلاشبہہ ایک جُرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

عجز دراصل حقیقت شناسی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام ہے۔ عجز کوئی مجبورانہ چیز نہیں، عجز دراصل وہ مثبت کیفیت ہے جو حقیقتِ اعلیٰ کے اختیارانہ اعتراف سے پیدا ہوتی ہے۔ عجز کوئی انفعالی کیفیت نہیں، وہ تمام فعّال کیفیات سے زیادہ بڑی فعّال کیفیت ہے۔

قرآن: تلاشِ فطرت کا جواب

دسمبر 2003 میں اسپین کے شہر اشبیلیہ (Seville) میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے بھی اُس میں شرکت کی۔ اِس کانفرنس میں امریکا کے ایک سینئر پروفیسر آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں ایک متلاشیٔ حق (truth seeker) تھا۔ میں آئڈنٹٹی کرائسس (identity crisis) کے مسئلے سے دوچار تھا، پھر میں نے قرآن کو پڑھا۔ میں نے قرآن میں اپنی آئڈنٹٹی کو دریافت کرلیا:

I have discovered my identity in the Quran.

یہ معاملہ صرف ایک شخص کا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں ہر عورت اور مرد آئڈنٹٹی کرائسس (identity crisis) کے مسئلے سے دوچار رہتے ہیں، کوئی شعوری طور پر کوئی غیر شعوری طور پر۔ مگر بیش تر لوگ اِس دریافت سے محروم رہتے ہیں۔ لوگوں کا ٹنشن میں مبتلا ہونا، اِسی بنا پر ہوتا ہے۔ ہر آدمی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی آئڈنٹٹی کو جانے، لیکن اِس معرفت میں ناکامی اُس کو ٹنشن میں مبتلا کردیتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ کوئی عورت یا مرد جب پیدا ہوکر اِس دنیا میں آتے ہیں، تو فطری طور پر اُن کے ذہن میں اِس قسم کے سوالات ابھرنے لگتے ہیں — میں کون ہوں۔ میں کیسے بن گیا۔ میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ موت کیا ہے، اور موت کے بعد کیا۔ میں کہاں سے آیا ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے، وغیرہ۔ اِنھیں سوالات کا نام آئڈنٹٹی کی تلاش ہے۔ برطانی سائنس داں سر جیمز جینز (وفات: 1946) نے دیکھا کہ بظاہر دنیا میں اِن سوالات کا جواب موجود نہیں، چناں چہ اس نے اپنی کتاب — پُراسرار کائنات (The Mysterious Universe) میں لکھا ہے کہ — بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آگیا ہے جو اس کے لیے نہیں بنائی گئی تھی:

Man has strayed into a world that was not made for him.

تحفہ کلچر

ایک بیرونی سفر میں میری ملاقات کویت کے ایک عرب پروفیسر سے ہوئی۔ ان کے ہوٹل کے کمرہ میں ہم دونوں نے نماز پڑھی۔ اس وقت وہ ایک رسٹ واچ پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے بیزاری کے ساتھ گھڑی کو اتارا اور اس کو میز پر رکھ دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ گھڑی ٹھیک کام نہیں کرتی، وہ چلتے چلتے رک جاتی ہے۔ میں نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ تحفہ کی گھڑی ہے۔ میں نے مزید پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ابھی حال میں کسی نے ان کو جلد ہی یہ گھڑی تحفہ میں دی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا کویت میں بھی تحفہ دینے والوں کا یہی مزاج ہے۔ انھوں نے کہا کہ تحفہ کے معاملے میں ہر جگہ کے لوگوں کا مزاج ایک ہی ہے، یعنی ایسی چیز دینا جو کارآمد ہونے سے زیادہ نمائشی ہو۔

تحفہ کے بارے میں یہ شکایت میں نے بہت سے لوگوں سے سنی ہے۔ میں ذاتی طور پر اس قسم کے تحفہ کو ایک گناہ کا فعل سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ایسا تحفہ تبذیر (فضول خرچی) کے ہم معنی ہے۔ اور تبذیر کو قرآن میں ایک شیطانی عمل کہا گیا ہے (الإسراء: 27)۔ اس قسم کے نمائشی تحفہ میں صرف مال ضائع ہوتا ہے، ایسا تحفہ کسی حقیقی ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔

حدیث میں آیا ہے کہ: تهادوا تحابّوا (الأدب المفرد للبخاری) یعنی ایک دوسرے کو ہدیہ دو، اس سے آپس میں محبت بڑھے گی۔ اِس حدیث کے مطابق، صحیح ہدیہ وہ ہے جو آپس میں سچی محبت بڑھائے۔ جو ہدیہ محبت پیدا کرنے کے بجائے آپس میں کدورت پیدا کرے، جس سے ایک دوسرے کے بارے میں رائے خراب ہو جائے، ایسا ہدیہ بلاشبہہ ہدیہ کی ضد ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی ہدیہ۔

تحفہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک، نمائشی تحفہ اور دوسرے، حقیقی ضرورت کا تحفہ۔ عام طور پر لوگ نمائشی تحفہ دیتے ہیں۔ ایسے تحفہ میں پیسہ تو خرچ ہو جاتا ہے، لیکن وہ تحفہ کسی آدمی کے لیے کار آمد ثابت نہیں ہوتا۔ اِس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی یا تو حقیقی تحفہ دے، یا وہ سرے سے کوئی تحفہ نہ دے۔ نمائشی تحفہ دینا ہرگز سنتِ رسول کی پیروی نہیں ہے۔ نمائشی تحفہ دینا صرف ایک جرم ہے، نہ کہ کوئی اچھا کام۔

دعوت اور اقدام کا فرق

دعوت پُر امن تبلیغ کا نام ہے۔ اِس کے برعکس، اقدام یہ ہے کہ کسی کے خلاف عملی کارروائی کی جائے، اِس فرق کی بنا پر دونوں کی نوعیت بالکل بدل جاتی ہے۔ پُر امن دعوت کا کام ہر حال میں کیا جائے گا، خواہ لوگ اس کو قبول کریں یا نہ کریں، لیکن عملی اقدام کے معاملے میں اس کے نتیجہ (result) پر غور کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر نتیجہ نکلنے والا ہو تو یہ اقدام کیا جائے گا اور اگر نتیجہ نکلنے والا نہ ہو تو عملی اقدام سے کامل پرہیز کیا جائے گا۔

دعوت کا انحصار تمام تر داعی کی اپنی ذات پر ہوتا ہے۔ داعی کا اپنا ارادہ کافی ہے کہ دعوت کے عمل کو انجام دیا جائے۔ اگر داعی حقیقی طور پر اپنی دعوتی ذمے داری ادا کردے تو اس کو کامیاب سمجھا جائے گا، خواہ مدعو گروہ نے اُس کی دعوت کو قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

عملی اقدام کا معاملہ اِس سے بالکل مختلف ہے۔ عملی اقدام میں ایسا ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کے ساتھ مقابلہ اور ٹکراؤ پیش آتا ہے۔ اِس بنا پر، عملی اقدام دو گروہوں کے درمیان طاقت آزمائی (power struggle) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق کو زیر کرنے کے لیے اپنے ذرائع کو استعمال کرنے لگتا ہے۔ یہ مقابلہ آرائی اکثر فساد اور تشدد اور جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ عملی اقدام، اکثر حالات میں کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔

اِس فرق کی بنا پر ہر فرد یا گروہ کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ اپنی کوششوں کو پر امن دعوت تک محدود رکھے، وہ ہرگز عملی اقدام نہ کرے۔ عملی اقدام بطور دفاعی کارروائی تو جائز ہو سکتا ہے، لیکن دفاعی صورتِ حال کے بغیر اقدام سرے سے جائز نہیں۔ اِس اصول کی خلاف ورزی کسی بھی حال میں، کسی بھی فرد یا گروہ کے لیے درست نہیں — پُر امن فکری کوشش ہر حال میں کی جا سکتی ہے، لیکن عملی اقدام صرف اُس وقت کیا جائے گا، جب کہ وہ نتیجہ خیز ثابت ہونے والا ہو۔

خدا کا وجود

انسان جب رحمِ مادر (womb) کے خول میں ہوتا ہے، تو اس کو اُس وقت خول کے باہر کی دنیا کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا۔ اِس خول کے باہر ایک پوری دنیا موجود ہوتی ہے، لیکن بچے کو اِس کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ خود انسان کا بھی ہے۔ انسان کی تمام معلومات زمان ومکان (time and space) کے اندر تک محدود ہوتی ہیں۔ وہ زمان ومکان کے باہر کی حقیقتوں کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا۔

برٹش فلسفی جان اسٹوارٹ مِل (وفات: 1873) جب نوجوانی کی عمر میں تھا، اُس وقت اس کے باپ جیمس مل (وفات: 1836) نے اُس سے کہا کہ خدا کا عقیدہ ایک غیر عقلی عقیدہ ہے۔ کیوں کہ اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا، تو سوال یہ ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا:

If God created man, who created God.

یہ بات جان اسٹوارٹ مل نے اپنی آٹو بائنگریفی میں لکھی۔ اِس کے بعد اِس بات کو برٹرنڈ رسل (وفات: 1970) اور جولین ہکسلے (وفات: 1975) جیسے فلاسفہ دہرانے لگے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ جیمس مل کے تقریباً سو سال بعد 1916 میں البرٹ آئن اسٹائن (وفات: 1955) نے نظریۂ اضافیت (theory of relativity) پیش کیا۔ اِس نظریے کے تحت آئن اسٹائن نے دکھایا کہ اِس دنیا میں انسان کا ہر علم اضافی (relative) ہے، نہ کہ حقیقی (real)۔ آئن اسٹائن نے ثابت کیا کہ انسان کے پاس کوئی مطلق فریم آف ریفرنس موجود نہیں:

No absolute frame of reference exists.

جیمس مل کے زمانے میں انسان کا علم ایک سائنٹفک خول (scientific womb) کے اندر محدود تھا۔ آئن اسٹائن نے سو سال بعد انسان کو اِس خول کی موجودگی کی خبر دی۔ ایسی حالت میں اب انسان کے لیے عقلی رویہ صرف یہ ہے کہ وہ بالاتر حقائق کے بارے میں اپنی علمی محدودیت (limitations) کا اعتراف کرے، نہ کہ وہ اُن کے بارے میں یقین کے ساتھ علمی بیانات دینے لگے۔

تعمیرِ دنیا، تعمیرِ شخصیت

ایک آدمی ایک معاشی کام شروع کرتا ہے۔ اُس میں اس کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ پیسے کی طاقت سے اس کے سب کام بننے لگتے ہیں۔ وہ اپنے لیے ایک گھر چاہتا ہے تو وہ ایک اچھا گھر بنالیتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایک سواری چاہتا ہے تو اس کو بازار سے ایک اچھی سواری مل جاتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کی اچھی تعلیم چاہتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ یہ مقصد بھی اس نے حاصل کرلیا۔ غرض، دنیوی اعتبار سے وہ پورے معنوں میں ایک کامیاب انسان بن جاتا ہے۔

یہ تجربہ آدمی کے اندر یہ ذہن پیدا کرتا ہے کہ اِس دنیا میں پیسہ سب کچھ ہے۔ پیسہ کماؤ اور ہر چیز حاصل کرلو۔ اِسی مزاج کو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں بیان کیا— اے زر، تو خدا نہیں۔ لیکن خدا کی قسم، تو عیب کو چھپانے والا ہے اور حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے:

اے زر، تو خدا نۂ ولیکن بہ خدا ستّارِ عیوب وقاضیُ الحاجاتی

دوسری طرف، وہ انسان ہے جو خدا سے ڈرتا ہے، جو خدا پرستی کی زندگی اختیار کرتا ہے، جو آخرت کو اپنی منزلِ مقصود بناتا ہے۔ ایسا شخص بھی ایک دنیا کی تعمیر کرتا ہے۔ یہ خود اپنی شخصیت کی تعمیر ہے، جو انسان کے داخل میں ہوتی ہے۔ وہ مادّی چیزوں کی طرح لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی، لیکن بلاشبہہ دنیا کی تعمیر سے زیادہ بڑا کام اپنی شخصیت کی تعمیر ہے۔

دنیا کی تعمیر، موت سے پہلے کی زندگی میں ہوتی ہے اور موت کے وقت وہ اِس دنیا میں رہ جاتی ہے۔ موت کے وقت جب آدمی اپنی زندگی کا اگلا سفر کرتا ہے تو وہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جاتا۔ اِس کے برعکس، جو آدمی اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے، وہ ابدی طور پر اس کے ساتھ رہتی ہے۔ ایسا آدمی جب مرتا ہے تو وہ اپنی اِس شخصیت کے ساتھ اگلے دورِ حیات میں داخل ہوتا ہے۔ یہ ربانی شخصیت اس کے لیے جنت میں داخلے کا اجازت نامہ ہوتی ہے۔ اپنی اِس شخصیت کی بنا پر وہ جنت میں اپنے لئے ابدی مقام حاصل کرلیتا ہے، اور اِس سے بڑی کوئی کامیابی کسی انسان کے لیے نہیں۔

یہ بھی جھوٹ ہے

ایک صاحب کو میں نے دیکھا کہ ان کا وزن کافی بڑھا ہوا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ شاید کھانے پینے میں احتیاط نہیں کرتے۔ اِس لیے آپ کا وزن بڑھ گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، میں تو روٹی اور سبزی اور روٹی اور دال جیسا سادہ کھانا کھاتا ہوں۔ لیکن جب میں نے اسکروٹنی (scrutiny) کی، تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر میں تو سادہ کھانا کھاتے ہیں، لیکن جب وہ باہر نکلتے ہیں تو اکثر وہ جنک فوڈ (junk food) کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسا تقریباً روزانہ ہوتا ہے۔

یہ بھی ایک جھوٹ ہے اور اِس قسم کے جھوٹ میں اکثر لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ ہمارے سماج میں ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو بالکل برہنہ جھوٹ بولیں، لیکن مذکورہ قسم کا جھوٹ تقریباً تمام لوگ بولتے ہیں، حالاں کہ کذبِ جلی اگر گناہ ہے، تو کذبِ خفی بھی بلاشبہہ ایک گناہ ہے۔ دونوں میں درجہ کے اعتبار سے فرق ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ دوسروں کی نظر میں اچھے بنے رہیں۔ یہی وہ نفسیات ہے جس کی بنا پر لوگ کذبِ خفی کی برائی میں مبتلا رہتے ہیں، وہ صاف انداز میں بات نہیں کرتے۔ وہ ٹوسٹ (twist) کرکے بولتے ہیں۔ کسی سوال کا جواب وہ اِس انداز میں دیتے ہیں کہ ان کی کم زوری چھپی رہے، وہ لوگوں کے علم میں نہ آئے۔

کذبِ خفی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اُس سے آدمی کے اندر کم زور شخصیت (weak personality) بنتی ہے۔ کم زور شخصیت اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہی چیز ہے جس کو مذہب کی زبان میں منافقت کہا جاتا ہے، اور منافقت بلاشبہہ انسان کے لیے ایک سخت تباہ کن چیز ہے۔

آدمی کو صرف یہ نہیں کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کھلے کھلے حرام سے بچائے۔ اِس نوعیت کا پرہیز تو ایک حیوان بھی کرتا ہے۔ انسان کو اِس سے اوپر اٹھنا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ نہ صرف حرام چیزوں سے بچے، بلکہ وہ ایسی چیزوں سے بھی مکمل پرہیز کرے جس سے اس کے اندر کم زور شخصیت کی پرورش ہوتی ہو۔

موت کے بعد

موت ہر انسان کے لیے ایک غیر مطلوب واقعہ ہے۔ آدمی لمبی مدت تک جینا چاہتا ہے، مگر وہ اچانک ایک دن مر جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی سفر میں تھا، وہ زیادہ دور تک جانا چاہتا تھا، مگر منزل پر پہنچنے سے پہلے موت نے یک طرفہ فیصلے کے تحت، اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ ہر عورت اور ہر مرد کا سوال ہے۔ ہر ایک یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیوں کر ایسا ہوتا ہے۔ زندگی کیا ہے اور موت کیا۔ کیوں ایسا ہے کہ آدمی زیادہ دن تک جینا چاہتا ہے، مگر اس کو درمیان ہی میں اس کی مرضی کے بغیر، موت کے فیصلے کو قبول کرنا پڑتا ہے۔

جب ہم اِس معاملے پر غور کرتے ہیں تو ہم کو سب سے پہلا سُراغ (clue) ڈی این اے (DNA) کی جدید دریافت میں ملتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر انسان کے اندر اس کا ڈی این اے بھی موجود ہوتا ہے۔ ہر انسان کا ڈی این اے گویا کہ اس کی شخصیت کا مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اِس ڈی این اے کو ڈی کوڈ (decode) کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہماری بڑی سے بڑی انسائیکلو پیڈیا سے بھی سیکڑوں گنا زیادہ بڑا ہے۔ ہر انسان کے ڈی این اے میں اس کی شخصیت (personality) کے تمام چھوٹے اور بڑے پہلو موجود ہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ ڈی این اے انسانی شخصیت کے صرف ایک پہلو کے اندراج سے خالی ہے۔ کسی انسان کے ڈی این اے کا مطالعہ کر کے، اس کے بارے میں ہر بات کو معلوم کیا جا سکتا ہو، مگر صرف ایک بات کو معلوم کرنا ممکن نہیں، اور وہ یہ کہ کسی انسان کی موت کب واقع ہوگی۔ یہ فطرت کی طرف سے اِس بات کا اعلان ہے کہ انسان اپنی حیثیت کے اعتبار سے ایک نہ مرنے والی مخلوق ہے۔ انسان کے لیے مسلسل زندگی ہے، حقیقی معنوں میں اس کی شخصیت پر موت وارد ہونے والی نہیں۔

اب یہاں انسانی شخصیت کے ایک اور پہلو کو شامل کر لیجیے، وہ یہ کہ تمام ذی حیات چیزوں میں صرف انسان ہے جو کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ تمام حیوانات صرف آج (today) میں

جیتے ہیں، کسی حیوان کا کوئی کل نہیں۔ اپنے محدود شعور کے اعتبار سے حیوانات میں سے ہر ایک کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آج میں پیدا ہوئے اور آج ہی میں ان کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر انسان استثنائی طور پر ایک ایسی مخلوق ہے جو واضح طور پر کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔

اِس معاملے میں درست رائے قائم کرنے کے لیے ایک پہلو کو شامل کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر آدمی جو اِس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ ان گنت تمناؤں (ambitions) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مگر اِسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی اِس طرح مرجاتا ہے کہ اس کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں۔ اِس اعتبار سے، ہر آدمی نامکمل تمناؤں (unfulfilled desires) کا کیس ہے۔ کائنات کے عام نظام کو دیکھیے تو یہ واقعہ بالکل بے جوڑ ہے۔ اِس وسیع کائنات میں صرف انسان ہے جو اِس مسئلے سے دوچار ہے، انسان کے سوا کوئی بھی دوسری مخلوق اِس مسئلے سے دوچار نہیں۔

یہ صورتِ حال بتا رہی ہے کہ اِس مسئلے کا جواب ہونا چاہیے۔ انسان کی تمناؤں کو اُسی طرح فل فل مینٹ ملنا چاہیے جس طرح دوسری مخلوقات کو ملا ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا آنے والی ہے، یعنی وہ دنیا جہاں انسان اپنی تمناؤں کی کامل تسکین پا سکے۔

اِس طرح اِس معاملے کا ایک اور پہلو بہت زیادہ اہم ہے، وہ یہ کہ انسان کے اندر فطری طور پر انصاف (justice) کا ذہن پایا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اِس دنیا میں عدل کے ساتھ فیصلہ ہو۔ نیک لوگوں کو ان کی نیکی کا پورا بدلہ ملے، اور بُرے لوگوں کو ان کی برائی کی سزا دی جائے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ تقاضا بھی چاہتا ہے کہ ایک دنیا آئے، جہاں عدل کا یہ تقاضا پورا ہو۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

مذکورہ سوالات کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو آخرت (hereafter) کا نظریہ بالکل حقیقی نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ آخرت کے نظریے کو ماننے کی صورت میں آدمی کو ہر سوال کا مکمل جواب مل جاتا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر درست ہوجاتی ہے:

Every thing falls into place.

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

آج کل مسلمان مختلف مقامات پر متشددانہ کارروائی میں مبتلا ہیں۔ جب اُن کو اِس سے روکا جائے، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو وہی کر رہے ہیں جس کا حکم ہم کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ اِس سلسلے میں وہ اُس حدیثِ رسول کو پیش کرتے ہیں جس میں اہلِ ایمان کو تغییرِ منکر کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں: **مَن رأى منكم منكراً فلْيغيّره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان** (**صحيح مسلم، كتاب الإيمان**) یعنی تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے، تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، اور اگر وہ اِس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے، اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنے دل سے، اور یہ سب سے زیادہ کم زور ایمان ہے۔ دوسری روایت میں اِس حدیث کا پہلا ٹکڑا اِن الفاظ میں آیا ہے: **مَن رأى منكراً فاستطاع أن يغيّره بيده فليغيّره بيده** (**سنن أبي داؤد، كتاب الملاحم**) یعنی جو شخص کسی منکر کو دیکھے، تو اگر وہ استطاعت رکھتا ہو تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ روایت کے بقیہ الفاظ مشترک ہیں۔

اِس حدیث کو عام طور پر تشدد کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے، حالاں کہ حدیث میں اِس کا ذکر نہیں ہے۔ اِس حدیث میں منکر کو عملاً بدل دینے، یا عملاً بدل دینے کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں اس کے خلاف بولنے کا ذکر کیا گیا ہے، نہ کہ منکر کو دیکھ کر لوگوں کے اوپر تشدد کرنے کا، یا خودکُش بم باری (suicide bombing) کا۔ اِس حدیث سے متشددانہ کارروائیوں کا جواز ہرگز نہیں نکلتا۔

اِس روایت میں منکر کی تغییر کا لفظ آیا ہے۔ تغییر کے معنی عربی زبان میں بدل دینے (replacement) کے ہیں، یعنی منکَر کی حالت کو بدل کر غیر منکر کی حالت قائم کرنا۔ اِس حدیث میں اصلاحِ حال کا حکم ہے، نہ کہ تخریب اور فساد کا۔

عربی زبان کے مشہور لغت 'لسان العرب' میں تغییر کا مفہوم اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے—

غیّرہ: حوّلہ وبدّلہ کأنہ جعلہ غیر ما کان (40/5) اس کی تغییر کی، یعنی اس کو بدل دیا۔ گویا کہ اس کو ایسا بنا دیا جیسا کہ وہ پہلے نہ تھا۔ امام راغب الاصفہانی (وفات: 1108) نے اپنی کتاب 'المفردات فی غریب القرآن' میں اِس لفظ کی تشریح اِس طرح کی ہے: یقال غیّرتُ داری إذا بنیتھا بناءً غیر الّذی کان۔ کہا جاتا ہے کہ میں نے اپنے گھر کی تغییر کی، یعنی جب تم اس کی تعمیر کو بدل کر دوسری طرح اس کی تعمیر کرو (صفحہ 368)۔

موجودہ زمانے میں جگہ جگہ جہاد کے نام پر تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔ یہ ''مقدس تشدد'' مسلم رہ نماؤں کی قیادت میں انجام پا رہا ہے۔ اِس فعل میں تقریباً تمام امت شریک ہے۔ اِس لیے کہ جو لوگ براہِ راست اس میں شریک نہیں ہیں، وہ اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے، اُن کی یہ خاموشی بالواسطہ شرکت کا درجہ رکھتی ہے۔ اِس لیے اسلامی اصول کے مطابق، پوری امت کو اِس عمل میں شریک مانا جائے گا، کچھ لوگوں کو براہِ راست طور پر، اور بقیہ لوگوں کو بالواسطہ طور پر۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اِس متشددانہ عمل کا کوئی بھی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ اِس عمل کا ہر جگہ صرف ایک ہی نتیجہ نکل رہا ہے، اور وہ تخریب ہے، نہ کہ تعمیر۔ ایسی حالت میں بلاشبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ متشددانہ کارروائیاں اور جو کچھ ہوں، لیکن وہ تغییرِ منکر کا عمل ہرگز نہیں۔ تغییرِ منکر یہ ہے کہ آدمی ناپسندیدہ صورتِ حال کو بدل کر اس کی جگہ پسندیدہ صورتِ حال قائم کرے۔ اِس کے برعکس، ایک ایسی کوشش جو کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہو، وہ یقینی طور پر تخریب اور فساد ہے، نہ کہ کوئی مطلوب اسلامی عمل۔

کسی غیر مطلوب صورتِ حال کو دیکھ کر اس کے خلاف منفی ردعمل ظاہر کرنا، صرف فساد کا ایک عمل ہے، وہ تغیر منکر نہیں۔ تغیر منکر مکمل طور پر ایک مثبت عمل ہے۔ وہ حالات کی اصلاح کے لیے کیا جاتا ہے، نہ کہ حالات کو مزید بگاڑنے کے لیے۔ اصلاحِ حال کا طریقہ یہ ہے کہ غیر متاثر ذہن کے ساتھ حالات کا مطالعہ کیا جائے اور پھر تعمیری منصوبہ بندی کے ذریعے صورتِ حال کو درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ اِس کے خلاف کریں، وہ بلاشبہہ مفسد ہیں، نہ کہ مصلح۔

مسلمان کی حیثیت

اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے، مسلمان داعی ہیں اور دوسری تمام اقوام اُن کی مدعو، یعنی مسلمان خدا کے امین ہیں اور اُن کی یہ ذمّے داری ہے کہ وہ اِس امانت کو تمام انسانوں تک پہنچائیں۔ اِسی فرض کی ادائیگی میں اُن کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک انتہائی نازک خدائی ذمّے داری کا معاملہ ہے۔ مسلمان اپنی اِس ذمے داری کو صرف اُس وقت ادا کر سکتے ہیں، جب کہ وہ اِس ذمے داری کے تقاضوں کو سمجھیں اور اُس کو اپنی زندگی میں بھرپور طور پر استعمال کریں۔ داعی کی ذمّے داری صرف داعیانہ کردار کے ساتھ ادا کی جاسکتی ہے، داعیانہ کردار کے بغیر دعوتی ذمّے داری کو ادا کرنا اُسی طرح ناممکن ہے جس طرح کسی عورت کے لیے مادرانہ شفقت کے بغیر ماں کی ذمّے داری کو ادا کرنا۔

قرآن کے الفاظ میں، دعوت کا آغاز نُصح (الأعراف: 68) سے ہوتا ہے، یعنی مدعو کے لیے یک طرفہ خیر خواہی۔ دعوتی اخلاق کا تقاضا ہے کہ داعی کے دل میں اپنے مدعو کے لیے صرف مثبت جذبات ہوں، منفی جذبات سے اُس کا دل مکمل طور پر خالی رہے۔ اِسی کا نام یک طرفہ خیر خواہی ہے۔ اِس قسم کی یک طرفہ خیر خواہی کے بغیر داعی اپنی داعیانہ ذمّے داری کو ادا نہیں کرسکتا۔

موجودہ دنیا کا نظام اِس طرح بنا ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے، اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ناخوش گوار تجربات ہوتے رہتے ہیں، ایک کی کوئی بات دوسرے کے لیے اشتعال انگیزی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ فطرت کا نظام ہے، اور فطرت کے نظام کو بدلنا ہرگز کسی کے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں، داعی کے اندر اپنے مدعو کے لیے یک طرفہ خیر خواہی کا جذبہ صرف اُس وقت برقرار رہ سکتا ہے، جب کہ وہ یک طرفہ اخلاقیات کے اصول پر قائم ہو۔ لوگوں کے ساتھ اُس کی روش دوسروں کے عمل کے زیر اثر نہ بنے، بلکہ وہ اُس کے اپنے سوچے سمجھے اصول کے تحت بنی ہو۔ وہ ردّعمل کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی ہو۔

مسلمان داعی گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس اعتبار سے، مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسری قوموں کے خلاف شکایت اور احتجاج کی تحریک چلائیں۔ داعیانہ شریعت میں، شکایت اور احتجاج کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ کیوں کہ مسلمان جس قوم کے خلاف شکایت اور احتجاج کی تحریک چلائیں گے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک مدعو قوم ہوگی۔ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی مدعو قوم کے ساتھ حریف قوم جیسا معاملہ کریں۔ مسلمانوں کو ہر حال میں اور ہر قوم کے ساتھ ہمیشہ معتدل تعلق کو برقرار رکھنا ہے۔ کیوں کہ معتدل تعلقات کے ماحول ہی میں دعوت الی اللہ کا کام ہوسکتا ہے۔ جہاں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان معتدل تعلقات نہ ہوں، وہاں دعوت کا کام انجام دینا ممکن ہی نہیں۔

قرآن کی سورہ نمبر 33 میں ایک حکم اِن الفاظ میں آیا ہے: **دَعْ أذاهم وتوكّل على الله** (الأحزاب: 48) یعنی اُن کی ایذاؤں کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان سے نہ مانگ کر اللہ سے مانگو، مطالباتی طریقہ چھوڑ کر دعا کا طریقہ اختیار کرو۔ اِسی لیے ہر پیغمبر نے اپنی مدعو قوم سے کہا کہ: **لا أسئلكم عليه مالا** (هود: 11) یعنی میں تم سے کسی مادّی فائدے کا طالب نہیں ہوں۔ میں صرف دینے والا ہوں، نہ کہ تم سے کوئی چیز لینے والا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مدعو قوم کے مقابلے میں، حقوق (rights) کے نام پر مطالباتی مہم چلانا، پیغمبرانہ سنت کے مطابق، سرے سے جائز ہی نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی۔ مگر جو چیز ختم ہوئی، وہ نبوت ہے، نہ کہ کارِ نبوت۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اب کوئی نیا پیغمبر آنے والا نہیں۔ لیکن جہاں تک پیغمبر کے دعوتی مشن کی بات ہے، وہ ہمیشہ اور ہر قوم کے درمیان جاری رہے گا۔ پیغمبر کے دعوتی مشن میں، بقدر استطاعت، اپنا حصہ ادا کرے۔ یہ دعوتی عمل ہر فردِ مسلم کے لیے فرض کی حیثیت رکھتا ہے (البقرة: 143)۔ جو لوگ اِس فرض کو ادا نہ کریں، اُن کے لیے سخت اندیشہ ہے کہ خدا کے نزدیک، وہ پیغمبر کے امتی ہونے کا حق اپنے لیے کھو دیں۔

بااصول زندگی

دنیا کا نظام اِس طرح بنا ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک کو دوسرے سے اختلاف پیش آتا ہے۔ یہ اختلاف مبنی برفطرت ہے۔ اِس لیے اُس کو کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی حالت میں، کامیاب زندگی کا اصول صرف ایک ہے، وہ یہ کہ لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ (adjust) کرکے زندگی گزاری جائے۔ اختلاف کو نظر انداز کرکے باہمی مفاد (mutual interest) کی بنیاد پر زندگی کا نظام قائم کیا جائے۔ اِس دنیا میں اِس کے سوا، کوئی انتخاب (option) کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اِس معاملے میں، مسلمانوں کا معاملہ دوسروں سے الگ نہیں ہے، البتہ مسلمان کو اِس معاملے میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ دوسروں کے لیے یہ ایڈجسٹ مینٹ (adjustment) صرف مفاد (interest) کا ایک معاملہ ہے، مگر مسلمان کے لیے یہ معاملہ ایک اعلیٰ عبادت کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اِس فرق کا سبب یہ ہے کہ مسلمان کا ایڈجسٹ مینٹ ایک اصول کے تحت ہوتا ہے، جب کہ دوسروں کا ایڈجسٹ مینٹ صرف دنیوی مفاد کے تحت پیش آتا ہے۔

مسلمان اپنی حیثیت کے اعتبار سے، ایک خدائی مشن کے حامل ہیں، یعنی خدا کے ابدی پیغام کو دوسرے تمام انسانوں تک پہنچانا۔ پیغام رسانی کا یہ کام صرف اُس وقت درست طور پر انجام پاسکتا ہے، جب کہ مسلمانوں اور غیر مسلم قوموں کے درمیان خوش گوار تعلقات قائم ہوں۔ مسلمان جب دوسری قوموں کے ساتھ ایڈجسٹ مینٹ کا معاملہ کرتا ہے تو اُس کا محرّک (incentive) اُس کا یہی دعوتی ذہن ہوتا ہے۔ وہ ذاتی مفاد کے لیے ایڈجسٹ مینٹ نہیں کرتا، بلکہ وہ صرف اِس لیے ایڈجسٹ مینٹ کرتا ہے، تاکہ اُس کا دعوتی مشن کسی رکاوٹ کے بغیر (peaceful) پُرامن انداز میں جاری رہے۔

محرک کا یہ فرق بہت اہم ہے۔ اِسی فرق کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان کا ایڈجسٹ مینٹ ایک ایسا عبادتی عمل بن جاتا ہے جو اُس کو آخرت میں اجرِ عظیم کا مستحق بنادے۔ اِس کے برعکس، دوسروں کا ایڈجسٹ مینٹ صرف ذاتی مفاد کی بنیاد پر ہوتا ہے، اِس سے زیادہ اُس کی کوئی اور حیثیت نہیں۔

مذکورہ قسم کا ایڈجسٹ مینٹ موجودہ دنیا کا ایک لازمی قانون ہے۔ اِس معاملے میں کسی بھی شخص یا گروہ کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اگر اصولی بنیاد پر ایڈجسٹ مینٹ نہ کریں تو اُن کو مفاد کی بنیاد پر لازماً ایڈجسٹ مینٹ کا معاملہ کرنا ہوگا۔ مگر ایسی صورت میں ان کا ایڈجسٹ مینٹ عبادت کا عمل نہ ہوگا، بلکہ وہ صرف موقع پرستی (expediency) کا ایک معاملہ ہوگا، یعنی وہی چیز جس کو شریعت کی زبان میں منافقت (hypocrisy) کہا جاتا ہے۔ اصول پسندی، ایک اعلیٰ اخلاقی صفت ہے، اِس کے مقابلے میں، موقع پرستی ایک انتہائی بُری صفت۔

اِس دنیا میں کسی آدمی کے لیے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب (option) ہے— اخلاص، یا منافقت۔ مخلصانہ زندگی میں منافقت کا کوئی مقام نہیں۔ اِسی طرح منافقانہ زندگی میں اخلاص کا کوئی درجہ نہیں۔ دعوتی مشن واحد مشن ہے جو آدمی کو اِس معاملے میں منافقانہ روش سے بچاتا ہے۔ دعوتی مشن آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ ربانی مشن کی خاطر دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹ مینٹ کا طریقہ اختیار کرے۔ بظاہر اگرچہ داعی بھی ایڈجسٹ مینٹ کا معاملہ کرتا ہے، مگر اُس کا ایڈجسٹ مینٹ اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے، نہ کہ مفاد کی بنیاد پر۔

یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اگر دعوتی مصلحت کی بنا پر دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹ مینٹ نہ کریں تو اُنھیں ذاتی مصلحت کی بنا پر دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹ مینٹ کرنا پڑے گا۔ گویا کہ اگر وہ دوسروں کے درمیان مخلص بن کر نہ رہیں تو اُنھیں دوسروں کے درمیان منافق بن کر رہنا ہوگا، اور بلاشبہہ منافقانہ زندگی سے زیادہ بُری کوئی چیز اِس دنیا میں نہیں۔

جنت کا مستحق کون

جنت خوشیوں اور راحتوں کی ایک ناقابلِ قیاس دنیا ہے۔ جنت صرف اُن لوگوں کو ملے گی جو ناقابلِ قیاس کردار کی قیمت دے کر، اس کا استحقاق ثابت کردیں۔ جنت، ابدی خدا کے پڑوس میں ابدی سیٹ حاصل کرنے کا نام ہے (القمر: 55)۔ اِس قسم کی غیر معمولی اقامت گاہ صرف انھیں خوش قسمت لوگوں کو مل سکتی ہے جو اُس کی اعلیٰ قیمت دینے کا حوصلہ کرسکیں۔

جنت کی ناقابلِ قیاس سیٹ کو پانے کے لیے انسان کو ناقابلِ قیاس عمل کا ثبوت دینا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ناقابلِ مشاہدہ (unobservable) کو قابلِ مشاہدہ (observable) بنا سکے۔ وہ زمان ومکان (time and space) کے اندر رہتے ہوئے، زمان ومکان کے باہر دیکھنے والی نگاہ پیدا کرے۔ وہ الفاظ کے تاریک جنگل میں معانی کی روشنی کو پاسکے۔ وہ خواہشوں کے سمندر میں رہتے ہوئے، اپنے آپ کو اِس سمندر میں ڈوبنے سے بچائے۔ وہ انانیت (egoism) کا پہاڑ ہوتے ہوئے، اپنے آپ کو بے انا (egoless) بنا سکے۔ وہ بدخواہ لوگوں کی بھیڑ میں رہتے ہوئے، اپنے آپ کو لوگوں کا خیرخواہ (well wisher) بنائے۔ وہ ایک کم زور انسان ہوتے ہوئے، ایک طاقت ور انسان کا رول ادا کرے۔ وہ کامل آزادی کا مالک ہوتے ہوئے، اختیارانہ طور پر اپنے آپ کو سرینڈر کردے۔ وہ نہ بولے ہوئے الفاظ کو سنے، اور نہ دکھائی دینے والی حقیقت کا اعتراف کرے۔ وہ جھوٹ سے بھری ہوئی دنیا میں سچ بولنے کا ثبوت دے۔ وہ بددیانتی (dishonesty) کے ماحول میں، دیانت داری (honesty) کے رویہ پر قائم رہے۔

خدا کے فرشتے دن رات سرگرم ہیں کہ وہ اُن لوگوں کی فہرست تیار کریں جو آخرت میں خدا کی جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی اعلیٰ معرفت نے ان کو اِس قابل بنایا کہ انھوں نے ہر دوسری چیز سے اپنی توجہ ہٹا کر صرف ایک خدا کو اپنا سپریم کنسرن (supreme concern) بنالیا۔ جن کا حال یہ تھا کہ ان کے شوقِ جنت نے ان کے لیے دنیا کی ہر پُرکشش چیز کو بے کشش بنا دیا۔

خدا کی عظمت (glory of God) کے احساس نے جن کے اندر سے فخر (pride) اور بڑائی کے تمام جذبات کو مٹا دیا۔ خدا کی پکڑ کے اندیشے نے جن کا یہ حال کیا کہ لذتوں کے درمیان رہتے ہوئے، لذتوں سے محظوظ ہونا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ جن کا حال یہ ہوا کہ جو آوازیں دوسروں کے لیے قابلِ سماعت آوازیں تھیں، وہ ان کے لیے نا قابلِ سماعت آوازیں بن گئیں۔ جن کو دنیا کی ترقی اور دنیا کی محرومی، دونوں یکساں طور پر بے معنیٰ نظر آنے لگیں۔ جن کا حال یہ تھا کہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے بجائے، ان کے لیے یہ کہنا زیادہ محبوب بن گیا کہ — میں غلطی پر تھا:

I was wrong

جنت ایک حقیقی مقام ہے۔ وہ حقیقی اوصاف کی قیمت ہی پر کسی کو حاصل ہوگی۔ جنت میں وہ انسان بسائے جائیں گے جو ربانی اوصاف کے حامل ہوں۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو اِن ربانی اوصاف کا حامل بنائیں، وہی وہ لوگ ہیں جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ٹھیریں گے۔ جنت کسی کو پُراسرار اسباب کے تحت نہیں ملے گی، بلکہ وہ کامل طور پر معلوم اسباب کے تحت ملے گی۔ اور وہ معلوم اسباب یہی ہیں کہ موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو اِن ربانی اوصاف کا حامل بنائے۔ جنت سچے انسانوں کی کالونی ہے۔ موجودہ دنیا میں انھیں سچے انسانوں کا انتخاب (recruitment) کیا جارہا ہے۔ موجودہ دنیا کی زندگی میں جو لوگ کامل طور پر سچے انسان ثابت ہوں، وہی جنت کی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ٹھیریں گے۔

پہلی واپسی، دوسری واپسی

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود (بنی اسرائیل) کے لیے پیشگی طور پر دو وعدہ (appointed time) مقرر فرمایا تھا (الإسراء: 4)۔ حضرت ابراہیم کے ذریعے نافذ ہونے والے خدائی منصوبے کے مطابق، یہود کا وطن ارضِ فلسطین قرار پایا۔ اِس کے بعد ان کی لمبی تاریخ کے دوران یہ مقدر تھا کہ اُن کے ساتھ دوبار یہ واقعہ پیش آئے گا کہ وہ اپنے وطن فلسطین سے نکل کر بیرونی علاقوں میں منتشر ہوجائیں گے اور پھر اپنے وطن فلسطین کی طرف دوبارہ واپس آئیں گے۔ گویا کہ یہود کی نسل دوبار ڈائس پورا (diaspora) کی صورت اختیار کرے گی اور پھر وہ اپنے وطن کی طرف واپس آئے گی۔

حضرت یوسف کے زمانے میں بنی اسرائیل، کنعان (فلسطین) سے ہجرت کر کے مصر گئے۔ اُس وقت اُن کی تعداد 70 تھی (پیدائش: 27 :46)۔ بائبل کے بیان کے مطابق، اُن کی نسلیں 430 سال تک مصر میں آباد رہیں (خروج: 12:40)۔ اِس کے بعد حضرت موسیٰ کے زمانے میں مصر سے نکل کر وہ لوگ وادیٔ سینا کے علاقے میں آئے۔ اُس وقت (عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر) اُن کے مردوں کی تعداد 6 لاکھ ہوچکی تھی (خروج: 37 :12)۔ اس کے بعد وہ 1400 قبل مسیح میں حضرت موسیٰ کے خلیفہ یوشع بن نون (Joshua) کی قیادت میں اپنے وطن فلسطین میں داخل ہوئے۔ یہ یہودی تارکینِ وطن (Jews in diaspora) کے ارضِ فلسطین میں داخلے کا پہلا ''وعدہ'' تھا۔ یہ داخلہ خدا کے حکم کے مطابق ہوا۔ اِس کا ذکر قرآن کی اِس آیت میں آیا ہے: **یا قوم ادخلوا الأرض المقدسة التی کتب الله لکم** (المائدة: 21) یعنی موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ارضِ مقدس میں داخل ہوجاؤ، جس کو خدا نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ دوسرا وعدہ کب پورا ہوا، یا کب پورا ہوگا۔ اِس معاملے میں قرآن کی ایک آیت سے رہنمائی ملتی ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر 17 میں یہود کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: **فإذا جاء وعد الآخرة جئنا بکم لفیفًا** (الإسراء: 104) یعنی جب

دوسرے وعدہ کا وقت آئے گا تو ہم تم کو ہر جگہ سے سمیٹ کر (فلسطین میں) لے آئیں گے۔

بنی اسرائیل (یہود) کے ساتھ یہ دوسرا وعدہ کب پورا ہوا، جب کہ وہ فلسطین میں دوبارہ واپس آئے۔ اِس دوسرے وعدہ (وعد الآخرۃ) سے مراد غالباً وہی واقعہ ہے جو بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پیش آیا۔ بال فور ڈکلریشن (Balfour Declaration) کے تحت 1948 میں یہودی تارکینِ وطن (Jews in diaspora) کی واپسی اپنے وطن فلسطین کی طرف شروع ہوئی اور آخر کار فلسطین کے نصف حصے میں ریاستِ اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔

پہلی واپسی کا مقصد یہ تھا کہ یہود کو دوبارہ اُن کا بھولا ہوا خدائی سبق یاد دلایا جائے۔ اِس طرح وہ دوبارہ فلسطین میں اِس لیے اکھٹا کیے گئے ہیں کہ اُنھیں خدا کا پیغامِ حق پہنچایا جائے، تاکہ اُن میں جو سعید روحیں ہیں، وہ حق کو قبول کر کے خدا کی ابدی رحمت کی مستحق بنیں۔ اور جو لوگ بھٹکے ہوئے ہیں، اُن کو ایکسپوز (expose) کیا جاسکے۔ حدیث میں نزولِ مسیح کے زمانے میں جس قتل یہود کا ذکر ہے، اُس سے مراد جسمانی قتل نہیں، بلکہ اس سے مراد یہود کو ایکسپوز کرنا ہے، تاکہ قیامت سے پہلے یہ واضح ہو جائے کہ وہ حق پر قائم تھے، یا وہ حق کو چھوڑ کر حق سے دور چلے گئے تھے۔

اِن واقعات کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہود کا اجتماع جو 1948 میں اسرائیل کے اندر ہوا، وہ خدائی منصوبے کے عین مطابق تھا۔ اب یہ مطلوب تھا کہ امتِ مسلمہ اُن کو مدعو کے روپ میں دیکھے اور ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اُنھیں حق کا پیغام پہنچائے۔ یہ یہود کے اوپر آخری اتمامِ حجت ہوگا۔ اِس کے بعد اگلا مرحلہ قیامت کا مرحلہ ہوگا۔ یہ مرحلہ خداوندِ ذوالجلال کے سامنے حاضر ہونے کا مرحلہ ہوگا، یہود کے لیے اور امتِ مسلمہ کے لیے اور ساری دنیا کے لیے۔

عرب-اسرائیل ٹکراؤ جو 1948 میں شروع ہوا، اُس کا سب سے زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ 60 سال کے خونی تصادم کے باوجود اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا، بلکہ عملاً وہ صرف کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوا ہے۔ جہاد کے نام پر کی جانی والی اِس جنگ کا یہ معکوس نتیجہ کیوں برآمد ہوا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ جہاد اعداء اللہ کے خلاف ہوتا ہے۔ عرب-اسرائیل جنگ اپنی نوعیت

کے اعتبار سے کسی دشمن کے خلاف جنگ نہیں، بلکہ وہ حقیقت (reality) کے خلاف جنگ ہے۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ حقیقت کے خلاف لڑ کر کوئی بھی شخص یا گروہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

بائبل کے بیان کے مطابق، فلسطین یہود کے لیے ارضِ موعود (promised land) ہے (استثناء 8:1)۔ یہی بات قرآن میں اِس طرح کہی گئی ہے کہ فلسطین یہود کے لیے ارضِ مکتوب (assigned land) ہے (المائدۃ: 21)۔ اِس طرح بائبل اور قرآن دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہودی تارکینِ وطن (Jews in diaspora) کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے اصل وطن کی طرف واپس جا کر وہاں آباد ہوں۔ پھر قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہودی تارکینِ وطن دوبار بڑے پیمانے پر اپنے وطن کی طرف واپس ہوں گے۔ واپسی کا پہلا واقعہ حضرت موسیٰ کے بعد یوشع بن نون کے زمانے میں ہوا۔

اِسی طرح قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربِ قیامت سے پہلے یہودی تارکینِ وطن دوسری بار مختلف ملکوں سے سمٹ کر فلسطین واپس آئیں گے۔ یہ واقعہ بطور پیشین گوئی قرآن کی سورہ نمبر 17 میں آیا ہے (الإسراء: 104)۔ اِس آیت کی تشریح میں مفسر ابوالحسن الماوردی (وفات 1058ء) نے تین اقوال نقل کیے ہیں۔ اُن میں سے ایک قول یہ ہے: وعد الآخرة: أي وعد الكرّة الآخرة في تحويلهم إلى أرض الشام (تفسير النكت والعيون) یعنی اِس آیت میں وعدۂ ثانی سے مراد یہودی تارکینِ وطن کی شام (فلسطین) کی جانب دوسری واپسی ہے۔

یہودی تارکینِ وطن کو دوبارہ فلسطین میں بسنے کا موقع دینا ایک عظیم واقعہ تھا۔ اِس کا تقاضا تھا کہ یہودی، خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے ان کی دیرینہ قومی آرزو کو پورا کیا۔ دوسری طرف، ان کے پڑوسی مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ یہود کو دعوتِ حق کا مخاطب بنائیں، وہ ان کو سچائی کا پیغام دیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اِس معاملے میں دونوں ہی گروہ ناکام ثابت ہوئے۔ نہ یہود نے خداوندِ ذوالجلال کا شکر ادا کیا، اور نہ مسلمانوں نے اپنی دعوتی ذمے داری کو انجام دیا۔ اِس اعتبار سے دونوں کا کیس بالکل ایک ہے۔ چناں چہ دونوں ہی فریق خدا کی نصرت سے محروم رہ گئے، یہود بھی اور مسلمان بھی۔

بلند فکری

موجودہ دنیا میں آدمی ہر وقت اپنے قریبی حالات میں گھرا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں صحیح سوچ کا مالک صرف وہ شخص بنے گا جو اپنے اندر بلند فکری (high thinking) کی صفت پیدا کرے، وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچے، وہ غیر متاثر ذہن کے تحت معاملات پر رائے قائم کرے۔ اِس طرزِ فکر کا فارمولا صرف ایک ہے — اپنی سطح سے اوپر اٹھ کر سوچنا:

To think beyond the limit.

آدمی ہمیشہ کچھ لوگوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے اس کو بار بار ناخوش گوار قسم کے تجربات پیش آتے ہیں۔ اِن ناخوش گوار تجربات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر بطور ردّ عمل طرح طرح کے غیر حقیقی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً غصہ، حسد، نفرت، انتقام، احساسِ برتری، یا احساسِ کم تری، وغیرہ۔ ہر آدمی اِسی قسم کے منفی احساسات کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ یہ احساسات جو ہمیشہ ردعمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوتے ہیں، وہ انسان کو غیر حقیقت پسندانہ سوچ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ وہ فطرت کے مقرر راستے سے ہٹ کر غیر فطری راستے پر چلنے لگتا ہے۔

اِس دنیا میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے، وہ متاثر ذہن کے تحت کوئی فیصلہ نہ کرے۔ وہ اپنے اندر وہ چیز پیدا کرے جس کو غیر متعصّبانہ ذہن، یا تخلیقی فکر (creative thinking) کہا جاتا ہے۔ ایسا ہی انسان اِس دنیا میں درست انداز میں سوچے گا اور اپنے عمل کی درست منصوبہ بندی کرے گا اور آخر کار کامیابی کی منزل تک پہنچے گا۔

بلند فکری کسی انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ بلند فکری میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ ہے، وہ ڈسٹریکشن (distraction) ہے، یعنی ذہن کا مختلف سمتوں میں منتشر ہو جانا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے ذہنی انتشار سے بچائے، تاکہ وہ اپنے اندر صحتِ فکر کو قائم رکھ سکے۔ یہ دراصل صحتِ فکر ہی ہے جو انسان کو حیوان سے ممیّز کرتی ہے۔

سب سے بڑا مسئلہ

مشہور امریکی پروفیسر جیرڈ ڈائمنڈ (Jared Diamond) کی پیدائش 1937 میں ہوئی۔ انھوں نے مختلف علوم پر ڈگریاں لیں۔ وہ ایک درجن زبانیں جانتے ہیں۔ ان کا ایک بامعنیٰ قول اِن الفاظ میں نقل کیا گیا ہے— واحد سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگ یہ دریافت نہیں کر پاتے کہ ان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے:

The single most important problem is our misguided focus on identifying the single most important problem! (The Times of India, New Delhi, July 6, 2008, p. 28)

یہ بات بالکل درست ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ لوگ اصل مسئلے کی پہچان کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ اِس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ غیر حقیقت پسندانہ طرزِ فکر (unrealistic approach) ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ عام طور پر وہ جذباتیت یا تعصب، وغیرہ کا شکار رہتے ہیں۔ اِس بنا پر وہ بے آمیز انداز میں سوچ نہیں پاتے۔ ایسے لوگوں کا حال اُس انسان جیسا ہوتا ہے جس کی آنکھ پر رنگین عینک لگی ہوئی ہو اور وہ اپنی اِسی رنگین عینک سے باہر کی چیزوں کو دیکھے۔ ایسا آدمی چیزوں کو اپنے رنگین شیشہ کی نسبت سے دیکھے گا، نہ کہ حقیقتِ واقعہ کی نسبت سے۔ اِس دنیا میں غلط عمل ہمیشہ اِسی قسم کے غلط مشاہدے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

جب آپ اصل مسئلے کو دریافت نہ کرسکیں تو اس کے بعد آپ اپنے مسئلے کے حل کی جو تدبیر کریں گے، وہ یقینی طور پر ناکام ہوجائے گی۔ آپ کا حال اُس شکاری جیسا ہوگا جو اپنے اصل نشانہ (target) کو صحیح طور پر متعین کیے بغیر اپنی بندوق چلا دے۔

جو آدمی یہ چاہتا ہو کہ وہ اپنے مسئلے کو صحیح طور پر حل کرسکے، اس کو چاہیے کہ سب سے پہلے وہ حقیقت پسندانہ انداز میں اصل مسئلے کی شناخت کرے۔ اور پھر اس کے حل کے لیے ٹھیک مطابقِ واقعہ منصوبہ بندی کرے۔ اِس کے بغیر مسئلے کے حل کی جو بھی تدبیر کی جائے گی، وہ یقینی طور پر ناکام ثابت ہوگی۔

منطقی طرزِ استدلال

ایک عالم سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے: استفتِ قلبك (اپنے دل سے پوچھ لو)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ دین کے تقاضے معلوم کرنے کا ایک ذریعہ قرآن اور حدیث کے علاوہ ہے، اور وہ کامن سنس (common sense) ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اِس لیے جو چیز فطری تقاضے کے مطابق ہو، وہ بھی اسلام میں داخل سمجھی جائے گی۔ مثال کے طور پر ہر شخص اپنے ماں باپ سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس کو دین کے مطابق سمجھتا ہے۔ حالاں کہ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی لفظی طور پر یہ لکھا ہوا موجود نہیں ہے کہ — اپنے ماں باپ سے محبت کرو۔

انھوں نے میری بات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ ماں باپ سے محبت کرنے کا حکم قرآن میں موجود ہے، پھر انھوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: وقضىٰ ربك أن لا تعبدوا إلاّ إيّاه وبالوالدين إحساناً (الإسراء: 23)۔ میں نے کہا کہ اِس آیت سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ اِس آیت میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے، وہ ماں باپ کی محبت نہیں ہے، بلکہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک ہے، یعنی ماں باپ کے ساتھ تمام انسانی اور اخلاقی تقاضے پورے کرنا۔ یہ ایک غیر منطقی استدلال ہے کہ جس آیت میں اخلاقی سلوک کا ذکر ہو، اُس سے قلبی محبت کا حکم نکالا جائے۔

منطقی استدلال کیا ہے۔ منطقی استدلال (logical argument) دراصل درست ریزننگ (correct reasoning) کا نام ہے۔ یعنی وہ استدلال جو حقائق پر مبنی ہو۔ جس میں متعلق (relevant) اور غیر متعلق (irrelevant) کے فرق کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے بات کہی جائے۔ ایسا استدلال جو مخاطب کے مسلّمہ پر مبنی ہو، نہ کہ کسی یک طرفہ مفروضے پر، جس کی بنیاد قطعی امور پر ہو، نہ کہ ظنی امور پر، جو جذباتی طرزِ فکر سے بالکل پاک ہو، جس میں کامل موضوعی فکر (objective thinking) پائی جائے۔ ایسے ہی استدلال کا نام منطقی استدلال ہے۔ اور منطقی استدلال ہی دراصل درست استدلال (correct reasoning) کا درجہ رکھتا ہے۔

خدا اور انسان

مسٹر اے اور مسٹر بی کے درمیان ایک پراپرٹی کے بارے میں نزاع ہوئی۔ مسٹر اے کا کہنا تھا کہ یہ پراپرٹی ان کی ہے اور مسٹر بی نے غلط کارروائی کرکے اُس پر ناجائز قبضہ کرلیا ہے۔ دونوں کے درمیان کافی بات چیت ہوئی، لیکن مسٹر بی اپنی غلطی ماننے پر تیار نہیں ہوئے۔ آخر کار مسٹر اے نے مسٹر بی سے کہا کہ اگر آپ خدا کی کتاب اپنے ہاتھ میں لے کر یہ کہہ دیں کہ یہ پراپرٹی آپ کی ہے، تو میں آپ کے دعوے کو مان لوں گا اور پراپرٹی پر آپ کا قبضہ تسلیم کرلوں گا۔ مسٹر بی نے اِس کے جواب میں کہا— اِس میں خدا کہاں سے آ گیا:

How does God come into the picture.

موجودہ زمانے میں یہی تقریباً تمام لوگوں کا حال ہے۔ ہر ایک اپنی مرضی کے مطابق، جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، اور جب اس کو خدا سے ڈرایا جائے تو وہ زبانِ حال یا زبانِ قال سے کہہ دیتا ہے کہ— اِس میں خدا کہاں سے آ گیا۔

یہ معاملہ صرف عوام کا نہیں ہے، بلکہ خواص بھی اِسی میں مبتلا ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانے میں جب طبیعی سائنس میں ترقی ہوئی اور فطرت کے قوانین دریافت کیے گئے، تو جدید تعلیم یافتہ طبقے نے عام طور پر، خدا کو کائنات سے خارج کر دیا۔ انھوں نے کہا جب سارے واقعات فطرت کے قوانین کے تحت ہو رہے ہیں، تو پھر کائنات کی توجیہہ کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت۔

خدا اِس دنیا کا خالق اور مالک ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ساری تاریخ میں انسان، خدا کو وہ اہمیت نہ دے سکا جو اہمیت اس کو دینا چاہیے تھا۔ انسان کا اپنا وجود مکمل طور پر خدا کا عطیہ ہے۔ مال اور اولاد کی صورت میں جو کچھ بھی اس کے پاس ہے، وہ خدا کا دیا ہوا ہے۔ روشنی اور آکسیجن اور غذا اور پانی جیسی ان گنت چیزیں انسان کو مسلسل طور پر حاصل رہتی ہیں۔ اِن چیزوں کا دینے والا بھی صرف خدا ہے۔ مگر اِس سب سے بڑی حقیقت کا پوری تاریخ میں سب سے کم اعتراف کیا گیا ہے۔ انسان کے پاس خدا کو دینے کے لیے صرف ایک ہی چیز تھی اور وہ تھا اس کا اعتراف، مگر انسان اِسی واحد چیز کو دینے میں ناکام ہو گیا۔

اہتزاز یا مشقت

ایک انگریز شاعر نے ایک نظم لکھی ہے۔ اِس نظم میں بطور خود ایک مفروضہ دنیا کا خوب صورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اِس مفروضہ دنیا کے ماحول میں مسرت ہی مسرت (happiness) ہے۔ اِس نظم کی ایک لائن یہ ہے — ہر طرف اہتزاز ہی اہتزاز:

Thrill, thrill, all the way

یہ ایک شاعرانہ مفروضہ ہے۔ ایسی کوئی دنیا حقیقت میں یہاں موجود نہیں۔ خالق نے اِس دنیا کو برائے امتحان بنایا ہے، نہ کہ برائے اہتزاز۔ قرآن کی سورہ نمبر 90 میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے (البلد: 4)۔ ایسی حالت میں، اِس دنیا میں مسرتوں سے بھری ہوئی زندگی حاصل کرنا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، یہ دنیا کبھی مسائل سے خالی نہیں ہوسکتی۔ اِس لیے اِس دنیا کے بارے میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ — ہر طرف مشقت ہی مشقت:

Trouble, trouble, all the way

ایسی حالت میں یہ صرف نادانی ہوگی کہ آدمی اِس دنیا میں اپنے لیے خوشیوں اور راحتوں کا ایک محل بنانے کی کوشش کرے، کیوں کہ یہاں ایسا محل بننے والا ہی نہیں۔ عقل مندی یہ ہے کہ آدمی اِس معاملے میں حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ پیشگی طور پر یہ یقین کرے کہ اِس دنیا میں اس کو مسائل کے جنگل میں زندگی گزارنا ہے۔ آدمی کو یہاں بے مسائل کی دنیا بنانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اُس کو مسائل کے ساتھ ایڈجسٹ مینٹ کرنے کا فن سیکھنا چاہیے:

Man has to learn the art of problem management.

ایڈجسٹ کرنے سے انسان کا ذہنی ارتقا ہوتا ہے۔ اِس طرح اس کے اندر اعلیٰ شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اِس کے ذریعے وہ انسانیتِ اعلیٰ کے مقام پر پہنچنے کے قابل بنتا ہے — زندگی ممکن کے دائرے میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کا نام ہے، نہ کہ ناممکنات کے دائرے میں احمقانہ چھلانگ لگانے کا۔

قسمتِ انسانی

ایک فرانسیسی مفکر ڈونوائے (Le Comte Donoy) کی ایک کتاب ہے جس کا نام قسمتِ انسانی (Human Destiny) ہے۔ اِس کتاب میں مصنف نے انسان کے ماضی اور حال سے بحث کی ہے۔ لیکن کتاب کے قاری کو آخر میں کنفیوژن کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔ اِس موضوع پر اور بھی بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھیں ہیں، لیکن یہ تمام کتابیں اپنے قاری کو کنفیوژن کے سوا کچھ اور نہیں دیتیں۔ وہ آدمی کو کسی مثبت نتیجے تک پہنچانے میں پوری طرح ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

اِس کا سبب غالباً یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں بہ یک وقت دو متضاد چیزیں پائی جاتی ہیں— جبر، اور اختیار۔ فلاسفہ یہ کرتے ہیں کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کو مرکزی خیال بنا کر اس کے تحت، انسان کی پوری زندگی کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ عملاً ممکن نہیں۔ جب یہ لوگ جبر کے پہلو کو لے کر تشریح کرتے ہیں تو اختیار کا پہلو چھوٹ جاتا ہے۔ اور جب وہ اختیار کے پہلو کو لے کر تشریح کرنا چاہتے ہیں تو جبر کا پہلو چھوٹ جاتا ہے۔ اِس بنا پر اُن کی فکر میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور تضاد فکری کا لازمی نتیجہ صرف کنفیوژن (confusion) ہے، اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اصل یہ ہے کہ انسان کا معاملہ دو پہلوؤں کے درمیان ہے— عمل کے اعتبار سے آزادی، اور انجام کیا عتبار سے مجبوری۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی وہ ایک لازمی قانون فطرت سے بندھ جاتا ہے۔ اِس قانون سے باہر جانا اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔

انسان پیدا ہوتے ہی ایک ابدی مخلوق بن جاتا ہے۔ پیدائش سے موت تک کی ایک محدود مدت تک وہ عمل کرنے کے لیے آزاد ہے، مگر وہ اِس کے لیے آزاد نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مرنے سے روک سکے۔ وہ محدود مدت تک عمل کرنے کے لیے آزاد ہے، مگر وہ اپنے عمل کے انجام سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔ موت سے پہلے کی زندگی میں وہ آزاد ہے کہ جو چاہے، کرے۔ مگر موت کے بعد کی زندگی میں وہ اپنے آپ کو اپنے عمل کے انجام سے بچانے پر قادر نہیں۔

معذوری کے باوجود

جو لوگ جسمانی اعتبار سے معذور ہوجاتے ہیں، اُن کو پہلے صرف معذور (disabled) کہا جاتا تھا۔ اِس کے بعد، اِس قسم کے لوگوں کے لیے ایک نیا لفظ استعمال ہونے لگا۔ یہ لفظ تھا— فزیکلی چیلینجڈ (physically challenged) یعنی وہ شخص جو جسمانی معذوری کی بنا پر چیلنج سے دوچار ہو۔ اب یہ لفظ بھی متروک ہورہا ہے۔ اب ایسے افراد کو ڈفرنٹلی ایبلڈ (differently abled) کہا جانے لگا ہے، یعنی وہ شخص جو بہ ظاہر معذوری کے باوجود کسی دوسرے پہلو سے لیاقت کا حامل ہو۔

اِس تبدیلی کا سبب یہ ہے کہ تجربے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کسی جسمانی معذوری سے دوچار ہوتے ہیں، وہ پورے معنوں میں معذور نہیں ہوجاتے، بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک اعتبار سے معذور ہونے کے بعد اُن کے اندر ایک اور اعتبار سے لیاقت (ability) پیدا ہوجاتی ہے۔ اِس لیاقت کو استعمال کرکے، وہ سماج کا مفید حصہ بن سکتے ہیں۔

امریکا میں معذور افراد کے بارے میں ایک رسرچ ہوئی ہے۔ یہ رسرچ امریکا کے ایک جرنل (BMC Neuroscience) میں چھپی ہے۔ اُس کا خلاصہ ٹائمس آف انڈیا (20 اگست، 2008) میں حسب ذیل عنوان کے تحت شائع ہوا ہے— انسان آواز کو دیکھ سکتا ہے، اور روشنی کو سن سکتا ہے:

Humans can see sound, hear light.

اِس رسرچ میں بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص اندھا ہوجائے، تو اس کے سننے کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ کوئی شخص بہرا ہوجائے، تو اس کے دیکھنے کی طاقت زیادہ ہوجاتی ہے اور اگر کوئی شخص اندھا اور بہرا دونوں ہوجائے، تو اُس کی چھونے کی طاقت (قوتِ لامسہ) میں اضافہ ہوجاتا ہے:

> Sensory cell can process an alternative sensation. Where eyesight is poor, the ears take up the slack and stimulate the visual system. This may explain how blind people develop such advanced hearing skills and, similarly, why the deaf often possess superior sight. (p. 37)

خوشی صرف آخرت میں

چارلی چپلن (Charlie Chaplin) ایک برٹش فلم اسٹار تھا۔ اس کی پیدائش 1889 میں ہوئی۔ اور 88 سال کی عمر میں 1977 میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک مزاحیہ اداکار (comedian) تھا۔ اس کا شو دیکھ کر لوگ بہت زیادہ ہنستے تھے۔ مگر خود چارلی چپلن اندر سے غم گین رہتا تھا۔ تمام مادّی ساز وسامان کے باوجود، اس کو اپنی زندگی میں خوشی حاصل نہیں ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک نفسیاتی ڈاکٹر (psychiatrist) کے پاس ایک شخص آیا۔ اُس نے کہا کہ میں بہت زیادہ افسردہ رہتا ہوں، آپ مجھ کو کوئی ایسی تدبیر بتایئے کہ میں خوش رہ سکوں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم چارلی چپلن کا شو دیکھا کرو۔ آنے والے نے کہا کہ میں ہی تو چارلی چپلن ہوں۔ میں دوسروں کو ہنساتا ہوں، لیکن میرا دل اندر سے روتا ہے۔

چارلی چپلن ایک کامیڈین (comedian) تھا، مگر جب موت کا وقت قریب آیا، تو وہ اپنی نفسیات کے اعتبار سے ایک ٹریجڈین (tragidian) بن چکا تھا۔ وہ شخص جو دوسروں کو ہنساتا تھا، اس نے اپنی حالت پر ایک بار اِن الفاظ میں تبصرہ کیا کہ — میں بارش میں چلنا پسند کرتا ہوں، تاکہ کوئی میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے:

I always like to walk in the rain, so that no one can see me crying.

یہی اِس دنیا میں ہر عورت اور مرد کی کہانی ہے۔ لوگ مصنوعی طور پر ہنستے ہیں، لیکن اندر سے انھیں کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ لوگ مصنوعی طور پر اپنی کامیابی کے قصے بیان کرتے ہیں، لیکن اندر سے وہ شکست خوردہ نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کے لیے بھی خوشی اور راحت نہیں۔ خوشی اور راحت صرف آخرت میں ہے جو موت کے بعد آنے والے دورِ حیات میں صرف خدا پرست عورتوں اور مردوں کو حاصل ہوگی۔ بنانے والے نے موجودہ دنیا کو عمل کے لیے بنایا ہے۔ یہاں صرف عمل برائے مسرت (happiness) ممکن ہے، نہ کہ خود مسرت کا حصول۔

ذہین آدمی کا فتنہ

ذہانت ایک عظیم نعمت ہے۔ مگر اِسی کے ساتھ ذہانت ایک عظیم فتنہ بھی ہے۔ جو آدمی زیادہ ذہین ہو، اُس کے اندر بہت جلد اپنے بارے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر، برتری کا احساس (superiority) پیدا ہوجاتا ہے۔ اِس احساسِ برتری کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کا اعتراف نہیں کر پاتا۔ اِس بے اعترافی کی مختلف صورتیں ہیں۔

اِس بے اعترافی کی بنا پر بعض افراد کا یہ حال ہوتا ہے کہ اُن سے کوئی بات کہی جائے تو فوراً وہ اس کے لیے اپنا کوئی ذاتی حوالہ ڈھنڈ لیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں نے بھی فلاں موقع پر یہ بات کہی تھی۔ کچھ افراد اپنے اِس مزاج کی بنا پر ایسا کرتے ہیں کہ جب اُن سے کوئی بات کہی جائے تو وہ فوراً اُس کو کاٹ دیں گے اور پھر اُسی بات کو خود اپنے لفظوں میں بیان کریں گے۔ اِسی طرح بعض افراد پوری بات کو نظر انداز کر کے ایک شوشہ نکال لیں گے، اور پھر وہ اِس شوشے پر اِس طرح تقریر کریں گے، جیسے کہ یہی شوشہ اصل ہے اور بقیہ باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

ایک اور قسم اُن افراد کی ہے جن کے سامنے کچھ باتیں کہی جائیں تو وہ اُس کو مثبت ذہن کے ساتھ نہیں سنیں گے۔ اُن کا ذہن اِس تلاش میں رہے گا کہ مختلف باتوں میں سے وہ کوئی ایک بات ڈھونڈ لیں جس میں بظاہر کوئی کم زور پہلو موجود ہو، اور پھر اِسی ایک بات کو لے کر وہ بقیہ کہی ہوئی تمام باتوں کو رد کر دیں گے۔

اِس مزاج کا یہ نقصان ذہین آدمی کے حصے میں آتا ہے کہ اس کا ذہنی ارتقا صرف محدود طور پر ہوتا ہے، وسیع تر انداز میں اس کا ذہنی ارتقا نہیں ہوتا۔ جو چیزیں اُس کے لیے ذاتی انٹرسٹ کی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً اپنا جاب (job) یا اپنے بچوں کا مستقبل، اس طرح کے معاملے میں وہ پوری طرح سنجیدہ ہوتا ہے۔ اِس لیے ایسے معاملے میں اس کا ذہن اچھی طرح کام کرتا ہے۔ بقیہ معاملات میں وہ سنجیدہ نہیں ہوتا، اِس لیے بقیہ اعتبار سے اس کا ذہنی ارتقا بھی نہیں ہوتا۔ اِس طرح عملاً وہ ایک ذہین بے وقوف، یا بے وقوف ذہین بن کر رہ جاتا ہے۔

شادی شدہ زندگی کے مسائل

شادی بظاہر ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ہوتی ہے، لیکن عملی اعتبار سے وہ دو مختلف کلچر کے درمیان ہوتی ہے۔ اِس حقیقت کو والدین نہیں سمجھتے۔ وہ شادی کے صرف دوسرے پہلوؤں کو جانتے ہیں، اور اِن دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے اپنے لڑکی کی شادی کر دیتے ہیں۔ بعد کو جب کلچرل فرق کی بنا پر زوجین کے درمیان مسائل پیدا ہوتے ہیں، تب بھی وہ اصل راز کو دریافت نہیں کر پاتے۔ دونوں فریق صرف یہ کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو برا بتاتے رہتے ہیں۔ نتیجۂ بیش تر شادیوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ — وقتی طور پر دھوم کے ساتھ شادی، اور پھر ہمیشہ کے لیے تلخ زندگی۔

لندن سے میرے پاس ایک مسلم خاتون کا ٹیلی فون آیا۔ ان کی پیدائش پاکستان میں ہوئی۔ اِس کے بعد ان کی شادی ایک ایسے مسلم نوجوان سے ہوئی جس کی پیدائش لندن میں ہوئی تھی۔ خاتون نے ٹیلی فون پر بتایا کہ اُن کی شادی کو کئی سال ہو چکے ہیں، لیکن اُنھیں پُر مسرت ازدواجی زندگی حاصل نہ ہو سکی۔ گفتگو کے دوران میں نے اُن سے صرف دو سوال کیے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے شوہر کردار (character) کے اعتبار سے کیسے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کردار کے اعتبار سے وہ ایک اچھے انسان ہیں۔ دوسرا سوال میں نے یہ کیا کہ آپ کے شوہر نے کبھی ایسا کہا کہ تم زیادہ بولتی ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، ایسا تو وہ اکثر کہتے رہتے ہیں۔

اِس کے بعد میں نے کہا کہ آپ کے مسئلے کی جڑ صرف ایک ہے۔ آپ پاکستانی کلچر کے مطابق، زیادہ بولنے والی شخصیت (outspoken person) ہیں، اور آپ کا شوہر برٹش کلچر کے مطابق، کم بولنے والا شخص (underspoken person) ہے۔ یہی فرق آپ کے شوہر کے اندر بار بار جھلاّ ہٹ (irritation) پیدا کرتا ہوگا۔ اِسی چیز نے آپ کی ازدواجی زندگی کو تلخ بنا دیا ہے۔ آپ صرف یہ کیجیے کہ اپنے آپ کو بدلیے اور بہت کم بولنے کی عادت ڈالیے۔ اِس کے بعد مذکورہ خاتون نے ایسا ہی کیا اور ان کی زندگی ایک خوش گوار زندگی بن گئی۔

رکاوٹ کے بغیر

26 اکتوبر 2002 کو نئی دہلی میں مسٹر محمد یٰسین (بھائی جی) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ بزنس میں آپ میرے گرو ہیں۔ پھر انھوں نے بتایا کہ وہ گولڈ اور سلور آرٹیکل کے اکسپورٹر ہیں۔ 20 سال پہلے وہ صرف ایک ''مزدور'' تھے۔ پھر انھوں نے گولڈ اور سلور کے آرٹیکل بنانے کا ابتدائی کام شروع کیا۔ مگر وہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس لائن میں اصل اکسپورٹر ایک ہندو تھے۔ وہ یہ کرتے تھے کہ ہمارے سامان میں کوئی نقص (defect) ہوتو وہ سامان کو رجکٹ (reject) کر دیتے تھے، جب کہ وہ ہندو کے بنائے ہوئے سامان کو نقص کے باوجود قبول کر لیتے تھے۔

اسی زمانہ میں میں نے ماہ نامہ الرسالہ میں ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان کو بھی اسی قسم کے تجارتی تعصب کا سامنا تھا۔ جاپان نے اس کا مقابلہ اس طرح کیا کہ اپنی فیکٹریوں میں زیرو ڈفکٹ (zero defect) کا اصول رائج کر دیا، یعنی ایسے سامان بنانا جو نقص (defect) سے صد فی صد پاک ہوں۔ اس معیار کو حاصل کرنے کے بعد دنیا کے لیے ناممکن ہو گیا کہ وہ جاپان کو نظر انداز کرے۔ میں نے اس بات کو پکڑ لیا اور محنت کر کے اپنے سامانوں کو زیرو ڈفکٹ کے اصول پر تیار کرنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے کامیابی ہوئی اور اب یہ حال ہے کہ 20 سال پہلے کا مزدور آج ایک بڑا اکسپورٹر بنا ہوا ہے۔

موجودہ دنیا چیلنج کی دنیا ہے۔ ایسی حالت میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ جب بھی کسی آدمی کے ساتھ اس قسم کی کوئی ناموافق صورت حال پیش آئے تو وہ اس کو شکایت اور تعصب کے طور پر نہ لے بلکہ وہ یہ سوچے کہ اس کا موثر مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں جس طرح ناموافق حالات ہیں، اسی طرح یہاں موافق حالات بھی بہت زیادہ ہیں۔ جو آدمی بھی کھلے ذہن کے تحت سوچے گا، وہ ضرور ناموافق پہلو کے اندر موافق پہلو کو تلاش کر لے گا۔ اور اس طرح اس کے لیے ممکن ہو جائے گا کہ اس کی زندگی کا سفر کسی رکاوٹ سے دوچار نہ ہو، اس کا سفر مسلسل جاری رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

عادت اور ضرورت

آدمی جب کوئی کام بار بار کرے اور برابر کرتا رہے، تو وہ دھیرے دھیرے اس کی زندگی کا ایک ایسا حصہ بن جاتا ہے کہ آدمی اس کو اپنی ضرورت سمجھنے لگتا ہے۔ اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ اس کے بغیر اس کا کام ہی چلنے والا نہیں۔ مگر اس قسم کی چیزیں آدمی کی عادت ہوتی ہیں، وہ اس کی ضرورت نہیں ہوتیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ عادت اور ضرورت میں فرق کرے۔ ضرورت والی چیز کو تو ضرور وہ اپنی زندگی میں شامل کرے، مگر جو چیز اپنی حقیقت کے اعتبار سے صرف ایک عادت کا درجہ رکھتی ہو، اس کو وہ ہرگز اپنی زندگی کا حصہ نہ بننے دے۔

ضرورت اس چیز کا نام ہے جس کے بغیر زندگی کی بقا ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس، عادت وہ چیز ہے جس کا تعلق آرام یا نمائش سے ہے۔ اس طرح کی چیز کو اگر چھوڑ دیا جائے تو اس سے آدمی کی زندگی میں کوئی حقیقی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔

مجھے اپنی زندگی میں اس قسم کے کئی تجربے ہوئے۔ مثلاً گھر کے رواج کے مطابق، میں شیروانی کا عادی ہو گیا تھا۔ چناں چہ شیروانی پہنے بغیر باہر جانا ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے میں پورا کپڑا نہیں پہنے ہوئے ہوں۔ مگر بعد کو جب مجھ کو شعور آیا تو میں نے شیروانی پہننا چھوڑ دیا۔ دھیرے دھیرے یہ حال ہو گیا کہ اب مجھ کو شیروانی یاد بھی نہیں۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ شیروانی میرے لیے صرف ایک عادت تھی، وہ میری ضرورت نہیں تھی۔ اِسی طرح کے اور کئی تجربے مجھے اپنی ذاتی زندگی میں پیش آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ صرف ایک ذاتی مزاج کا معاملہ ہے، وہ خدا کی پیدا کردہ فطرت کا تقاضا نہیں۔ ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے شعور کو اتنا بیدار کرے کہ وہ ضرورت اور عادت میں فرق کر سکے۔ اس کے بعد وہ عادت والی چیزوں کو چھوڑ دے اور ضرورت والی چیزوں کو اپنی زندگی میں باقی رکھے۔ زندگی کی تعمیر میں اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ جو لوگ اس کا لحاظ نہ رکھیں، وہ کبھی اپنی زندگی کی اعلیٰ تعمیر نہیں کر سکتے۔

بل تو اپنا بل

ایک قدیم ہندی مثل ہے کہ — بَل تو اپنا بَل۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جو کام کرے، وہ خود اپنی طاقت کی بنیاد پر کرے۔ دوسروں کی طاقت کے بھروسے پر کام کرنا، ایک ایسا تجربہ ہے جو بار بار ناکام ہوا ہے۔ اب اِس قسم کے تجربے کو دہرانا، کسی عقل مند آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے۔ وہ بزنس کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس سرمایہ کم تھا۔ اپنے محدود سرمائے سے وہ صرف چھوٹا بزنس کرسکتے تھے۔ انھوں نے بڑے بزنس کے شوق میں بینک سے قرض لے لیا، یا کسی کو اپنا پارٹنر (partner) بنالیا۔ چند سال کے بعد وہ پریشانی میں مبتلا ہوگئے۔ آخر کار اُن کا بزنس ناکامی کے ساتھ ختم ہوگیا۔

اِس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی محنت اور اپنے سرمائے پر بھروسہ کرے۔ اپنی محنت اور اپنے سرمائے سے اگر وہ صرف چھوٹا کاروبار کرسکتا ہے، تو اُس کو چاہیے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر اپنا کام شروع کرے اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے ترقی کے مقام تک پہنچے۔ یہی کام کا فطری طریقہ ہے۔ اِس کے برعکس، دوسرا طریقہ چھلانگ (jump) کا طریقہ ہے، اور چھلانگ کا طریقہ اِس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

چھوٹے چھوٹے چشموں سے مل کر دریا بنتا ہے۔ دھیرے دھیرے بڑھ کر ایک پودا درخت بنتا ہے۔ ذرہ ذرہ کے ملنے سے پہاڑ وجود میں آتے ہیں۔ یہی وہ فطری طریقہ (natural course) ہے جس سے اِس دنیا میں کوئی بڑا واقعہ وجود میں آتا ہے۔ انسان کو بھی اِسی فطری طریقے کی پیروی کرنا ہے۔ اِس دنیا میں کسی اور طریقے کو اختیار کرکے کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ یہی فرد کی کامیابی کا اصول ہے، اور یہی قوم کی کامیابی کا اصول بھی۔ اپنی ذاتی طاقت کے بعد جو چیز آدمی کے کام آتی ہے، وہ فطرت کا نظام ہے، نہ کہ کسی دوست یا پارٹنر کی مدد — اِس دنیا میں آدمی کا واحد مددگار فطرت کا نظام ہے، نہ کہ کسی دوسرے انسان کا تعاون۔

سوال وجواب

سوال

الرسالہ، ستمبر 2008 میں آپ نے ''معرفت حدیث، معرفتِ قرآن'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے کثرتِ مطالعہ اور کثرتِ دعا کی ضرورت ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، کثرتِ مطالعہ کے بجائے کثرتِ دعوت الی اللہ، اور دعا ہے۔ کیوں کہ صحابہ کو کثرتِ مطالعہ حاصل نہیں تھا۔ دن کو دعوت اور رات کو دعا سے اُن کو اللہ نے معرفتِ حدیث و معرفتِ قرآن کا حصہ عطا فرمایا تھا۔

میں صرف اِس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے آپ کو یہ تحریر لکھ رہا ہوں۔ میں آپ کا ہم فکر ہوں، ہم خیال ہوں۔ الرسالہ کے علاوہ، کوئی دوسرا مجلّہ پابندی سے نہیں پڑھتا۔ (حکیم محمد صفدر شریف عمری، تمل ناڈو)۔

جواب

دین کا ایک ظاہری علم ہے۔ یہ علم قرآن اور حدیث کے سادہ مطالعے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ دین کے علم کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق دین کی گہری معرفت سے ہے۔ یہ معرفت غور وفکر کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ اِس غور وفکر کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً محاسبۂ خویش ایک غور وفکر ہے۔ کائنات کا مشاہدہ ایک غور وفکر ہے۔ قرآن اور حدیث کا تحقیقی مطالعہ ایک غور وفکر ہے۔ دعوت الی اللہ کے دوران اپنی عقل کو متحرک رکھنا ایک غور وفکر ہے۔ کتابوں کا مطالعہ بھی غور وفکر کی ایک صورت ہے۔ غور وفکر کے اِس عمل میں اللہ سے مدد چاہنے کا نام دعا ہے۔ دعا کا تعلق ہر دوسرے عمل سے ہے اور اِسی طرح معرفت سے بھی۔

اصحابِ رسول بظاہر کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ اُس زمانے میں آج کی طرح مطبوعہ کتابیں موجود نہیں تھیں۔ لیکن حقیقتِ مطالعہ اُن کی زندگی میں پوری طرح شامل تھی، اور وہ ہے تفکر، تدبر، تذکر اور توسم، وغیرہ۔ اصحابِ رسول کا ذہن مسلسل طور پر اِن چیزوں میں مشغول رہتا تھا۔ مزید یہ کہ ان کے اندر سیکھنے کی طلب بے پناہ حد تک پائی جاتی تھی۔ وہ یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ چیزوں کو غیر متعصّبانہ ذہن کے ساتھ دیکھیں اور بے لاگ طور پر اس کے بارے میں رائے قائم کر سکیں۔ یہی

چیزیں مطالعے کا حاصل ہیں، اور اِس معنیٰ میں ہر صحابی پوری طرح ایک صاحبِ مطالعہ انسان تھا۔

سوال

اکثر لوگ اور علماء کہتے ہیں کہ علمِ نجوم سیکھنا گناہ ہے۔ یہ کس حد تک درست ہے۔ جب کہ حدیث میں آیا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اُس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ وہ کون سا علم ہے۔ علم بہر حال علم ہے۔ وہ علم جو عوامی فلاح و بہبود کے لئے موثر اور فائدہ مند ثابت ہو۔ چوں کہ علمِ نجوم بھی ایک علم ہے، لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ آپ اِس سوال کا جواب ارسال فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ (مولوی ایم ایس بابا تاج، کپواڑہ، کشمیر)

جواب

علماء نے علوم کی دو قسمیں کی ہیں — علومِ عالیہ، اور علومِ آلیہ۔ علومِ عالیہ سے مراد شریعت کا علم ہے، اور علومِ آلیہ سے مراد وہ علوم ہیں جو معاون علم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علمِ نجوم اپنی نوعیت کے اعتبار سے، علومِ آلیہ میں شامل ہے۔ اصولی طور پر وہ ایک جائز علم ہے۔ لیکن علمِ نجوم کے دو دور ہیں۔ ایک قبل از سائنس، اور دوسرا بعد از سائنس۔ سائنس کے ظہور سے پہلے جو علمِ نجوم دنیا میں رائج تھا، وہ تمام تر توہمات (superstitions) پر مبنی تھا۔ یہ قدیم علمِ نجوم بلا شبہہ ایک غیر مطلوب علم تھا، عقلی اعتبار سے بھی اور اسلامی اعتبار سے بھی۔ آج اگر کوئی شخص قدیم علمِ نجوم میں مشغول ہو تو وہ صرف ایک لغو کام میں مشغول ہونے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ اور قرآن میں اہلِ ایمان کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ لغو سے اعراض کرتے ہیں۔ (المؤمنون: 3)

موجودہ زمانے میں علمِ نجوم (astrology) سائنسی اعتبار سے ایک متروک علم بن چکا ہے۔ اب اِس معاملے میں جس علم کا رواج ہے، وہ علمِ فلکیات (astronomy) ہے۔ جدید علمِ فلکیات ایک خالص سائنسی علم ہے، اور مسلمانوں کو بلا شبہہ اِس علم میں درک حاصل کرنا چاہیے، کیوں کہ وہ پورے معنوں میں علومِ آلیہ میں شامل ہے۔

علومِ عالیہ یعنی شرعی علوم کی اہمیت یہ ہے کہ اُس کے ذریعے ہمیں خدا کی معرفت اور دین کا فہم حاصل

ہوتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں، علومِ آلیہ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں زندگی کی تعمیر وتشکیل کے لیے مددگار علم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اہلِ ایمان کے لیے دونوں کا حصول ضروری ہے۔

سوال

قرآن کی سورہ الصافات کی آیت نمبر 8 میں شیطان کے مارنے کی بابت تذکرہ آیا ہے۔ یہاں شیطان کو مارنے سے کیا مراد ہے۔ تذکیر القرآن صفحہ 1223 پر اس کی تشریح درج ہے۔ مگر بار بار اس کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی میں اس کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ (شاہ عمران حسن، نئی دہلی)

جواب

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم کی دو قسمیں ہیں — محکمات، اور متشابہات (آل عمران: 7) محکمات سے مراد وہ علم ہے جس میں ضروری معلومات (data) قابلِ حصول ہوں اور اِس بنا پر ان کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا ممکن ہو۔ علم کی اِس قسم کے بارے میں غور وفکر کرنا ایک مطلوب چیز ہے اور اس سے ذہنی ارتقا ہوتا ہے۔

متشابہات سے مراد وہ علم ہے جس میں ضروری معلومات قابلِ حصول نہ ہوں۔ ایسے علمی شعبے میں ہمارے لیے صرف یہ ممکن ہے کہ ہم علمِ قلیل (الإسراء: 85) پر قناعت کریں، اور مجمل علم سے زیادہ جاننے کی کوشش نہ کریں۔ کیوں کہ ایسا کرنا ہمیں کسی یقینی علم تک نہیں پہنچائے گا، بلکہ وہ ہمیں کنفیوژن میں مبتلا کردے گا۔ سورہ الصافات کی مذکورہ آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ اِسی علمِ قلیل کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس کو علمِ کثیر کے زمرے میں لاکر اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کرنا صرف ایک غیر مطلوب فعل ہے۔ اس کے نتیجے میں آدمی کو کنفیوژن کے سوا اور کچھ ملنے والا نہیں۔ اِس طرح کے معاملات میں آدمی کے لیے صرف ایک ہی ممکن راستہ ہے، وہ یہ کہ آدمی اُن کی کُنہ تک پہنچنے کے بجائے، اپنی محدودیت (limitations) کو جاننے کی کوشش کرے۔ اِس طرح کے معاملات میں اپنی محدودیت کو جاننا ہی سب سے بڑا علم ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — 193

1- لوک سبھا ٹی وی (نئی دہلی) کے تحت 3 دسمبر 2008 کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ یہ ڈسکشن لوک سبھا لائبریری (Lok Sabha Secretariat, Parliament Library) کی بلڈنگ میں ہوا۔ اِس ڈسکشن میں میرے علاوہ، تین اور پینلسٹ موجود تھے۔ ڈسکشن کا موضوع ٹررازم تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں موضوع کی وضاحت کی۔ اِس موقع پر سی پی ایس کے افراد بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے حاضرین کو اسلامی لٹریچر دیا اور ان سے انٹریکشن کیا۔

2- ہندی میگزین (نئی دہلی) کے نمائندہ نے 4 دسمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو کا موضوع بمبئی ٹرراٹیک تھا۔ سوالات کے دوران بتایا گیا کہ ٹررازم کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ جو مسلمان ٹررازم میں شامل ہیں، وہ اسلام کے نام پر ایک ایسا کام کر رہے ہیں جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی یہ ایکٹوٹی مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

3- سہارا ٹی وی (نوئڈا) کے اسٹوڈیو میں 4 دسمبر 2008 کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ یہ ڈسکشن بمبئی کے حالیہ بم دھماکے سے متعلق تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ سوالات کے دوران بتایا گیا کہ یہ صرف ایک مذموم فعل ہے، اسلامی تعلیمات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جو لوگ اسلام کے نام پر اسلام کو عالمی سطح پر بدنام کرنے کا یہ فعل کر رہے ہیں، اُنھیں چاہیے کہ وہ فوراً اس کو ترک کر دیں۔

4- ترکی کے ٹی وی چینل سہان انٹرنیشنل نیوز ایجنسی (Cihan International News Agency) کے نمائندہ مسٹر عثمان (Osman Unalan) نے 6 دسمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو کا موضوع بمبئی کا حالیہ بم دھماکہ تھا۔ انٹرویو کے دوران سوالات کی وضاحت کی گئی۔ یہ انٹرویو انگریزی زبان میں تھا۔ ترکی میں اِس انٹرویو کو انگریزی کے علاوہ، وہاں کی مقامی زبان میں نشر کیا جائے گا۔

5- سائی سنٹر (نئی دہلی) میں 11 دسمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک خطاب ہوا۔ اِس کا موضوع یہ تھا:

Basic Human Values in Islam

اِس بار کے پروگرام میں کیندریہ ودیالیہ کے پرنسپل حضرات کے بجائے مختلف سرکاری افسران شریک تھے۔ یہ افسران ایجوکیشن کے ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہیں۔ ایک گھنٹہ کی تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ اس کے بعد لوگوں کو اسلامی لٹریچر برائے مطالعہ دیا گیا۔

6- نئی دہلی کے ای ٹی وی نیوز (ETV New) کے نمائندہ مسٹر پرشانت (Prashant) نے 12 دسمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو کا موضوع اسلامی جہاد تھا۔ سوالات کے دوران بتایا گیا کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق، جہاد تشدد کا نام نہیں ہے، بلکہ جہاد پُرامن جدوجہد کا نام ہے۔

7- ٹائمس آف انڈیا (12 دسمبر 2008) میں صدر اسلامی مرکز کا ایک مضمون (A Religion of Peace) شائع ہوا۔ نیٹ کے ذریعے عالمی سطح پر بہت سے لوگوں نے اِس مضمون کو پڑھا۔ تقریباً ایک سو لوگوں نے اِس مضمون پر اپنے تاثرات لکھ کر روانہ کیے۔ اُن میں سے چند تاثرات یہاں درج کیے جاتے ہیں:

- I fully agree that today the face of Islam is marred by the wrong ideology developed by a handful of Muslim scholars which has permeated into the psyche of Muslims in general. (Khaja Kaleemuddin, USA)

- It is high time that people like Maulana united to spread the true message of Islam, whatever it is and also explain what exactly 'Jihad' means, and whether it is relevant in today's world. (Vijayalakshmi, Chennai)

- No sensible person, in my opinion, can disagree with Maulana's views regarding 'peace vs. terrorism' and how to promote the former and combat the latter. His insightful article may be adopted as a "Peace Manifesto" for the 21st century by all the peace-activists of the world. It has convincingly shown the right way to make the UNESCO's lofty vision: "Since the wars begin in the minds of men; it is in the minds of men that the defences of peace must be constructed" (Anis Luqman Nadwi, UAE)

- I fully agree with Maulana; terrorism is an ideology and it has to be countered at an ideological level. We need people with missionary zeal to take this message of peace all across the world. (S. Fakhir Shah, Pakistan)

- The Maulana is an authority not only on the history of Islamic Civilisation but also well versed in Islamic Jurisprudence and I bow my head in reverence to this article. (Mohd. Shahid Ansari, Lucknow)

- I am quite happy and proud that Maulana Wahiduddin Khan has clarified "there is no room for violence in Islam". I hope this helps reduce any misgivings among practitioners of other religions or would be "Jehadi terrorists". (Gopala Rao, New Delhi)

- Dear Maulana, greetings from America. Your recent article in the Indian press is to be commended for its courage. I imagine it is going to get some people riled up. It has clarity, spiritual maturity and an all embracing humanity, while remaining respectful of Islam. (Mantoshe Singh Devji, USA)

8- سی پی ایس انٹرنیشنل اور گڈ ورڈ (نئی دہلی) کی طرف سے 14 دسمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کے خطاب کا ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ یہ پروگرام نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر انیکسی میں ہوا۔ اِس کا عنوان یہ تھا:

Spirituality in Daily Life

صدر اسلامی مرکز نے اِس موضوع پر ایک گھنٹہ خطاب کیا۔ خطاب کے بعد حاضرین کو انگریزی میں چھپا ہوا

اسلامی لٹریچر برائے مطالعہ دیا گیا۔ حاضرین میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلم بڑی تعداد میں موجود تھے۔

9- مسٹر پرویز (Parvis Ghassem Fachandi) امریکا کی پرنسٹون یونی ورسٹی (نیو جرسی) میں انتھراپالوجی کی پروفیسر ہیں۔ ان کا تعلق جرمنی کی ایک مسلم فیملی سے ہے۔ 19 دسمبر 2008 کو وہ اسلامی مرکز (نئی دہلی) میں آئے اور صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران انھوں نے انڈین کلچر اور ہندو مسلم تعلقات کے موضوع پر ایک تفصیلی انٹرویو لیا۔ مسٹر پرویز کو مطالعے کے لیے حسب ذیل کتابیں دی گئیں:

Indian Muslims, The True Jihad, God Arises, The Ideology of Peace

10- انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر (لودھی روڈ، نئی دہلی) کے مین آڈی ٹوریم میں 19 دسمبر 2008 کی شام کو ایک پروگرام ہوا۔ اِس پروگرام کا موضوع یہ تھا: Muslims Initiative Against Terrorism

یہ پروگرام آئی ایم آر سی (Indian Muslims' Monitoring Research and Response Centre) کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر سی پی ایس انٹرنیشنل کے کچھ ممبران نے اس میں شرکت کی اور حاضرین کو ماہ نامہ الرسالہ کے علاوہ، اردو اور انگریزی میں چھپا ہوا اسلامی لٹریچر دیا۔

11- پیراڈائس پیچول سوسائٹی (بنگلور) کی طرف سے نیشنل کالج گراؤنڈ (بسوانہ گُڑی) میں 31-25 دسمبر 2008 کو ایک خصوصی اسپریچول بک فیئر لگایا گیا۔ بنگلور میں ایک دعوتی ادارہ (الفلاح پیس اینڈ اسپریچولٹی سنٹر) قائم ہے۔ اِس بک فیئر میں ادارہ الفلاح نے صدر اسلامی مرکز کے لٹریچر پر مشتمل ایک اسٹال لگایا۔ یہ اس گراؤنڈ میں واحد اسلامی اسٹال تھا۔ یہاں عالمی شہرت یافتہ ہندو اسکالر اور سوامی موجود تھے۔ انھوں نے الفلاح کے اسٹال سے بڑے پیمانے پر اسلامی لٹریچر حاصل کیا۔ لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

12- ایلی آرگنائزیشن (Ally Event Organization) کی طرف سے جموں وکشمیر میں 28-19 دسمبر 2008 کو ایک نیشنل بک فیئر لگایا گیا۔ یہ بک فیئر جموں شہر کے سنٹرل مقام گول مارکیٹ (گاندھی نگر) میں ہوا۔ گڈ ورڈس بکس (نئی دہلی) نے یہاں اسٹال لگایا۔ اِس بک فیئر میں یہ واحد اسلامی اسٹال تھا۔ اِس موقع پر الرسالہ سے وابستہ مقامی ساتھیوں نے اپنا غیر معمولی تعاون دیا۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقے کے بہت سے لوگ آئے اور انھوں نے اسلامی لٹریچر حاصل کیا۔ تقریباً 200 لوگوں نے اپنے تاثرات لکھے۔ یہاں صرف دو تاثرات نقل کیے جاتے ہیں:

1. I am highly influenced with the Islam and the Quran, and at the same time the honesty and humble attitude of Mr S. Imran Hasan. I wish for their success by their noble deed of spreading the Islam alongwith message peace. (Dr. Surinder Singh Sodhi, Jammu)

2. I am extremely pleased to see Goodword Books stall and obliged to get free fifts of many books from stal. (Dr Karan, President RWAG, Jammu)